

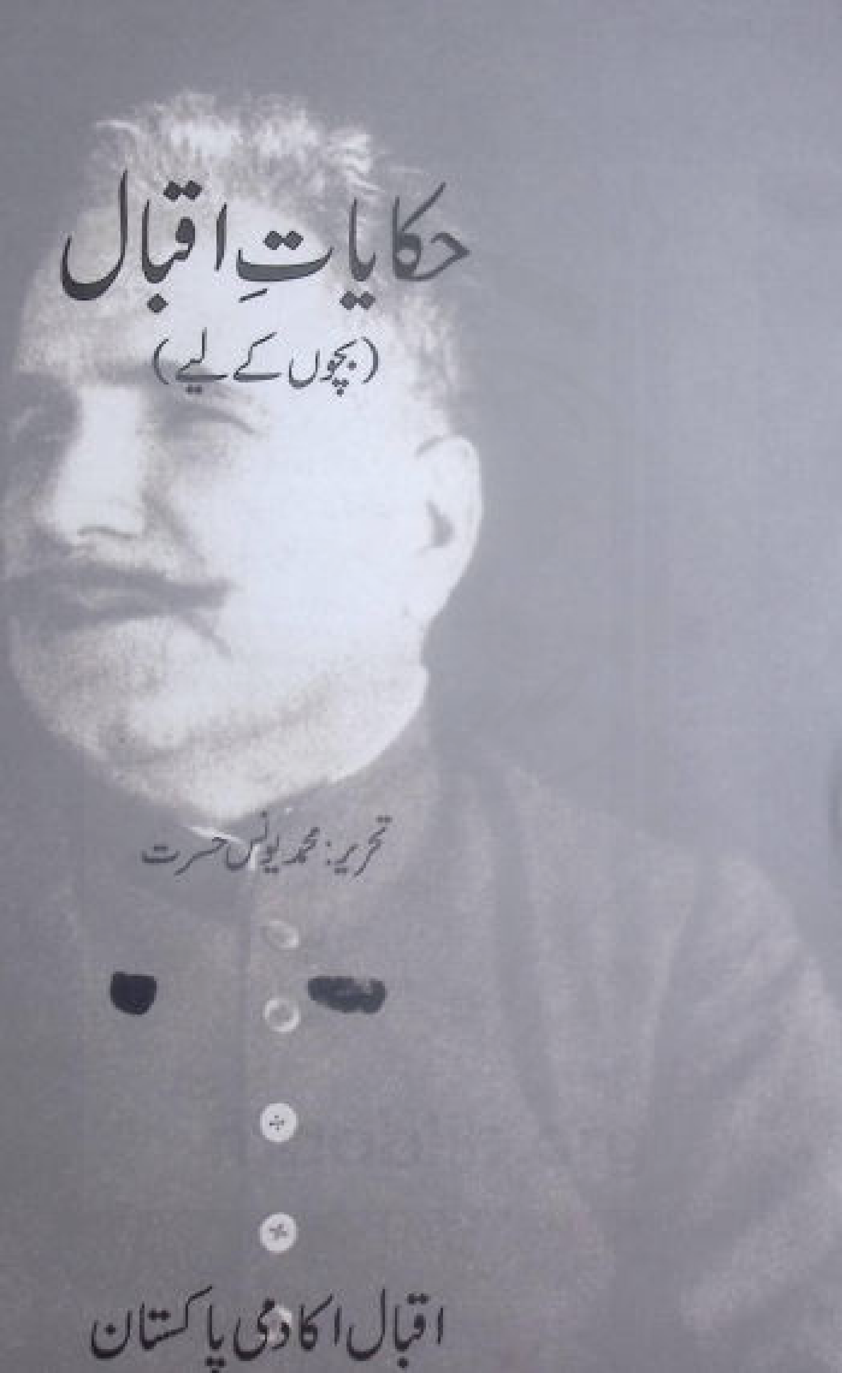
حکایاتِ اقبال

(بچوں کے لیے)

تحریر: محمد یونس حسرت

حکایاتِ اقبال

(بچوں کے لیے)



تحریر: محمد یونس حسرت

اقبال اکادمی پاکستان

ناشر

محمد سہیل عمر

ناظم، اقبال اکادمی پاکستان

حکومتِ پاکستان، وزارتِ ثقافت

چھٹی منزل، ایوانِ اقبال، لاہور

Tel:[92-42]631-45110
Fax:[92-42]6314496
Email: iqbalacd@lhr.comats.net.pk
Website: www.allamaiqbal.com

ISBN 969-416-374-9

طبع اوّل: ۲۰۰۶ء

تعداد: ۱۰۰۰

[redacted] [redacted]

کمپوزنگ، صفحہ بندی

تصاویر، لے آؤٹ ڈیزائننگ: ایجوکیشنل ریسورس ڈیولپمنٹ سنٹر کراچی

مطبع: شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور

فہرست

تعارف

بچوں کے لیے اقبال پر کام کرنا، کچھ ''سال اقبال'' ہی پر موقوف نہ تھا، اقبال اکادمی پاکستان نے اُن کے لیے دور رس اور مستقل نوعیت کے متعدد پروگرام بنا رکھے ہیں، جن میں سے بعض زیر تکمیل ہیں، کیونکہ اُن کے تکمیلی مراحل خاصے طویل ہیں۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ''سال اقبال'' کے موقع پر اقبال اکادمی نے بچوں کے لیے جو طرح طرح کے اشاعتی، سمعی و بصری پروگرام مرتب کیے، اتنی سنجیدگی، دل جمعی اور لگن کے ساتھ اس سے پہلے کبھی اور کہیں بھی مرتب نہ ہوئے تھے۔ اُن کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:

علامہ اقبال نے بچوں کے لیے جو نظمیں کہی ہیں، اُن کی اشاعت کے لیے خصوصی کلیات مرتب کیا گیا ہے۔

اقبال اکادمی نے پاکستان ٹیلی ویژن کے ساتھ مل کر بارہ حصوں پر مشتمل ''آئینۂ اقبال'' کے نام سے علامہ اقبال پر تعارفی پروگرام پیش کیا۔

''ذوقِ آگہی'' کے عنوان سے طلبہ و طالبات کے لیے ٹی وی کوئز مقابلے پاکستان کے اہم ٹی وی مراکز سے منعقد کرائے گئے۔

اسی طرح ریڈیو پاکستان کے معلوماتی مذاکروں میں شرکت کی گئی اور ''اقبال کوئز نیشنل چیلنج ٹرافی'' کا پروگرام پیش کیا گیا۔

''سال اقبال'' کے حوالے سے ایک اہم کام آڈیو، وڈیو سی ڈیز ہیں، جن میں سے تین دستاویزی فلموں کی حامل ہیں۔ تین سی ڈیز وڈیو موسیقی کی، تین کلام اقبال (اردو) کی آڈیو اور تین ملٹی

میڈیا کی ہیں۔ یہ سی ڈیز بڑوں کے ساتھ ساتھ نوجوانوں اور بچوں کے لیے بھی ہیں۔

ایک اور اہم خصوصی پیش کش "آل پاکستان ویب سائٹ مقابلہ" ہے۔ یہ مقابلہ ۵۱۵ گروپوں کے درمیان ہوا جس میں ملک بھر کے ایک ہزار سے زیادہ نوجوانوں نے شرکت کی۔ انھوں نے کل ۱۲۴ ویب سائٹس بنائی تھیں، جن میں سے ۸۰ ویب سائٹس معیاری قرار دی گئیں۔ ان مقابلوں میں جیتنے والوں کو انعامات دیے گئے۔

جدید عصری تقاضوں اور خصوصاً نوجوانوں کی تعلیمی و علمی ضروریات کے پیش نظر پیام اقبال عام کرنے کے لیے "اقبال اکادمی پاکستان" نے ایک بہت بڑی ویب سائٹ تیار کی ہے۔ اس ویب سائٹ پر علامہ اقبال کے تمام اردو، فارسی اشعار، اُن کے تراجم، اُن کی خطاطی، موسیقی، وڈیو، علامہ صاحب کی تصاویر اور حالاتِ زندگی کے علاوہ بہت سی ایسی معلومات یکجا مل جاتی ہیں جن کا جاننا ہر نوجوان کے لیے ضروری ہے۔

اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ کو اقبال سے متعارف کرانے کے لیے ایک سفری نمائش کا اہتمام کیا گیا۔ اس نمائش میں علامہ صاحب کی زندگی کے مختلف ادوار اور مواقع کی تصاویر، اہم واقعات، خیالات و افکار اور کتب و رسائل اس ترکیب و ترتیب سے پیش کیے گئے ہیں کہ نمائش میں گزرتے ہوئے اور ایک ایک چیز کو دیکھتے ہوئے علامہ صاحب کی حیات، شاعری اور افکار کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم ہو جاتی ہیں۔

ایک اور قابلِ ذکر کام "میرا اقبال" ہے۔ یہ چوتھی جماعت سے آٹھویں جماعت تک کے بچوں کے لیے پانچ علمی کتابوں کا ایک مفید سلسلہ ہے۔ اس کا مقصد بچوں میں اردو شاعری کا ذوق پیدا کرنا اور انھیں اقبال کے افکار و خیالات سے روشناس کرانا ہے۔ ہر کتاب کی اہم خصوصیات یہ ہیں: اقبال کے حالاتِ زندگی، اُن کی سرگرمیاں، منظومات کا انتخاب، بنیادی تصورات، سوالات، کیا

آپ جانتے ہیں، پراجیکٹس، فرہنگ، میری بیاض۔ اب ان پانچوں کتابوں کے ساتھ ہی سی ڈیز تیار کی جارہی ہیں ان کو جان داری (Animation)، سوال جواب، کھیل اور مشقوں کے ذریعے علامہ کی زندگی، شاعری اور تعلیمات کو بچوں اور نوجوانوں کے لیے انتہائی دلچسپ انداز میں پیش کیا جائے گا۔ اس سلسلے کو آگے بڑھانے کے لیے "میرا اقبال" ہی کے عنوان کے تحت چھٹی سے دسویں کتاب تک، یعنی نویں جماعت سے بی اے کے موجودہ نصاب کو مد نظر رکھ کر تیار کی جارہی ہیں، جن کو نصاب میں شامل کرانے کی کوشش کی جائے گی۔

"اقبال کی پھلواری" کے بغیر بچوں کے پروگراموں کا باغ سُونا سُونا نظر آئے گا۔ "پھلواری" میں معروف اداکار اور صداکار شجاعت ہاشمی صاحب کے تعاون سے علامہ اقبال کی نو نظمیں منتخب کر کے ملک کے بہترین موسیقاروں سے خوب صورت اور سریلی دھنوں میں تیار کرائی گئی ہیں۔ موسیقی سے معمور یہ نظمیں ۹ ٹیبلو کی شکل میں بہترین Sets، کوریوگرافی، میک اپ اور اچھی روشنوں کے ذریعے وڈیو پر منتقل کی گئی ہیں۔ ان کا اصل مقصد "پیامِ اقبال" ننھے منے بچوں کے ذہنوں تک منتقل کرنا ہے۔

مصوری کے کل پاکستان مقابلے بھی منعقد کرائے گئے، جن کے تحت نوجوان مصوروں کو اقبال کا پورٹریٹ بنانے کی دعوت دی گئی تھی۔ مقابلہ میں ہر عمر کے مصوروں کو شریک ہونے کا موقع دیا گیا۔ اقبال پر موضوعاتی مصوری کے مقابلے میں بھی ہر عمر کے مصور شریک ہو سکتے تھے۔ موضوعاتی مصوری کا ایک مقابلہ کالج اور یونیورسٹی کے نوجوان طلبہ وطالبات کے درمیان ہوا۔ ثانوی سکول کے طلبہ وطالبات کے لیے بھی مقابلہ کرایا گیا، جس میں ۲۴۲ تصویریں موصول ہوئیں، جن کے نتائج مرتب کر کے حق دار مصوروں کو انعامات اور اسناد دی گئیں۔

"اقبال اور نوجوان" کے عنوان کے تحت کئی منصوبے زیر تکمیل ہیں۔ مثلاً علامہ اقبال پر آن

لائن نصاب شروع کرنے کا منصوبہ۔ ایک ''اقبال البم'' تیار ہو رہی ہے جو بڑے سائز میں ۲۰۰ رنگین صفحات پر مشتمل ہو گی۔ تصاویر کی سی ڈی بھی جلد مکمل ہونے والی ہے، جس میں تقریباً ۵۰۰ تصاویر شامل ہیں۔

اس سلسلہ ہائے دراز کی ایک کڑی بچوں اور نوجوانوں کے لیے کتابوں کی اشاعت بھی ہے۔ ملک کے نامور ادیبوں اور مصنفین سے علامہ اقبال کے خاص حوالے سے کتابیں لکھوائی گئی ہیں۔ ان کتابوں کے نام ہی اُن کے متن کی تشریح ہے، مثلاً: پیامِ اقبال بنام نوجوانِ ملت، مقدر کا ستارہ اور سراغِ زندگی۔

حکایاتِ اقبال (بچوں کے لیے) پروفیسر محمد یونس حسرت مرحوم نے تحریر کیں اور اُن کی ایک ترتیب مقرر کی۔ پھر اس کی ترتیبِ نو اور تدوین کا فریضہ محمد نوید مرزا صاحب نے انجام دیا۔ حکایات کا انتخاب اقبال کے تمام اردو فارسی مجموعوں (بانگِ درا، بالِ جبریل، ضربِ کلیم، ارمغانِ حجاز، پیامِ مشرق، اسرار و رموز) سے کیا گیا ہے۔ کلامِ اقبال سے ماخوذ و منتخب حکایات کا یہ مجموعہ اُن شاہین بچوں کے لیے مرتب و شائع کیا گیا ہے، جنھیں علامہ اقبال اپنی اُمیدوں کا مرکز سمجھتے ہیں۔ یہ اقبال کی اُن چھوٹی چھوٹی نظموں کا انتخاب ہے، جس میں حکایت، مکالمے یا خطاب کا رنگ پایا جاتا ہے۔ ہر نظم کا عنوان درج کرنے کے بعد اس کا مفہوم و مطلب آسان زبان میں حکایت کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد مطلب کی تشریح اور پس منظر وغیرہ کی وضاحت کی گئی ہے۔

ناشر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

علامہ اقبالؒ نے اپنے کلام میں خالقِ کائنات سے لے کر مخلوقِ کائنات تک سب ہی سے خطاب کیا ہے لیکن وہ بطورِ خاص نوجوانوں کے شاعر ہیں۔ اُن کا خطاب براہِ راست نوجوانوں سے ہے۔ اُن کی تمام تر امیدیں نوجوانوں سے وابستہ ہیں اور وہی اُن کی امیدوں کا مرکز ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ نوجوان ہی اُن کے انقلابی افکار کو عملی صورت دے کر انقلاب برپا کر سکتے ہیں۔ انھوں نے اپنے کلام میں جگہ جگہ نوجوانوں کے بارے میں انھی جذبات وخیالات کا اظہار کیا ہے۔

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے مرا عشق، میری نظر بخش دے
خرد کو غلامی سے آزاد کر جوانوں کو پیروں کا اُستاد کر

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے ؟
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اِک ٹوٹا ہوا تارا؟

عقابی رُوح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اُن کو اپنی منزل آسمانوں میں

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارہ
شباب جس کا ہے بے داغ، ضرب ہے کاری

محبت مجھے اُن جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

جوانوں کو مری آہِ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پَر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نُورِ بصیرت عام کر دے

علامہ اقبالؒ کے نُورِ بصیرت کو عام کرنے کے لیے اہلِ علم نے بہ قدرِ ہمت و توفیق بہت کچھ کیا ہے لیکن یہ حقیقت ہے اس نورِ بصیرت کو بطورِ خاص تو جوانوں اور شاہیں بچوں میں عام کرنے کے لیے بہت کم سعی کی گئی ہے۔ ویسے بھی اس سلسلے میں اہلِ علم کی توجہ بالعموم علامہ اقبالؒ کی طویل نظموں کو حاصل رہی ہے اور دو دو، تین تین شعروں کی وہ نظمیں اُن کے التفات سے محروم رہی ہیں جن کا سلسلہ علامہ اقبالؒ کے سارے کلام میں پھیلا ہوا ہے اور جو بلاغت، ایجاز، شاعرانہ ساحری اور سبق آموزی کے لحاظ سے اُن کی طویل نظموں سے کم تر نہیں بلکہ اکثر صورتوں میں بہ قامت بہتر، بہ قیمت بہتر کی مصداق ہیں۔ ویسے تو علامہ اقبالؒ کا سارا ہی کلام ایجاز و بلاغت کا شاہکار ہے اور وہ دو ایک لفظوں میں وہ مضمون ادا کر جاتے ہیں جن کی تشریح و توضیح کے لیے دفتر درکار ہوتے ہیں لیکن اُن کی چھوٹی چھوٹی نظموں میں تو یہ ایجاز و بلاغت اپنے درجۂ کمال پر ہے۔

بچوں کو قصہ کہانی سے خاص رغبت اور دلچسپی ہوتی ہے۔ اسی امر کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے "حکایاتِ اقبال" کا یہ سلسلہ اُن جوانوں اور شاہیں بچوں کے لیے ترتیب دیا

گیا ہے جنھیں علامہ اقبالؒ اپنی امیدوں کا مرکز سمجھتے ہیں۔ یہ علامہ اقبالؒ کی اُن چھوٹی چھوٹی نظموں کا انتخاب ہے جس میں حکایت، مکالمے یا خطاب کا رنگ پایا جاتا ہے۔ شمع و شاعر اور خضرِ راہ جیسی طویل نظمیں اگرچہ اپنے اندر حکایت کا رنگ رکھتی ہوں لیکن اُنھیں بوجوہ اس انتخاب میں شامل نہیں کیا گیا۔

ہر نظم کا عنوان درج کرنے کے بعد اس نظم کے مطالب کو حکایت کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد نظم کی توضیح و تشریح اور پس منظر وغیرہ کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس طرح کلامِ اقبال کے گنجینۂ معانی کو ایک ایسے قالب میں ڈھال کر اقبال کے شاہین بچوں کے سامنے پیش کیا گیا ہے جو ان کا مانوس اور پسندیدہ قالب ہے۔

بنیادی طور پر یہ سلسلہ جوانوں اور شاہین بچوں کے لیے ترتیب دیا گیا ہے لیکن یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ علامہ اقبالؒ کے کلام و پیام سے دلچسپی رکھنے والے جملہ حضرات --- خواہ اُن کا تعلق کسی بھی طبقے اور کسی بھی عمر سے ہو --- اسے اپنے لیے قابلِ مطالعہ و استفادہ پائیں گے۔

پروفیسر محمد یونس حسرت
شعبۂ اردو
گورنمنٹ گورونانک کالج، ننکانہ صاحب

حکایاتِ بانگِ درا

فاطمہ بنتِ عبداللہ

طرابلس کی جنگ میں غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہوئی

۱۹۱۲ء



! تو ملتِ اسلامیہ کے لیے عزت اور آبرو کا سامان ہے۔ مسلمان اپنی بے حسی، غفلت اور کوتاہی فکر و عمل کی وجہ سے ایک مردہ قوم بن چکے تھے، لیکن تو نے اپنی قربانی اور شہادت سے ان کی لاج رکھ لی ہے۔ اب وہ بھی دوسری قوموں کو منہ دکھانے کے قابل ہوگئے ہیں۔ اب وہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہماری قوم بالکل مردہ نہیں۔ اس کے اندر فاطمہ جیسی دلیر اور حوصلہ مند لڑکیاں موجود ہیں۔ اے فاطمہ! تیرے جسم کی خاک کا ایک ایک ذرہ پاک اور معصوم ہے۔ اے صحرا کی حور! اے صحرا کی وسعتوں اور پاک و صاف فضاؤں میں پروان چڑھنے والی فاطمہ! تو بڑی خوش قسمت ہے کہ تجھے اللہ کے راستے میں لڑنے والے غازیوں کو پانی پلانے کی خدمت نصیب ہوئی۔ تیری یہ سعادت مندی اور خوش بختی ہر لحاظ سے قابلِ مبارک باد ہے۔ تو نے تلوار اور ڈھال کے بغیر اللہ کے راستے میں جہاد کیا۔ اللہ اللہ! شہادت حاصل کرنے کے شوق نے تجھ میں کیسی جرأت اور دلیری پیدا کر دی تھی!

اللہ اکبر! ملتِ اسلامیہ کے خزاں رسیدہ باغ میں ایسی کلی پیدا ہوئی اور ہماری راکھ میں ایسی چنگاری بھی چھپی ہوئی تھی! ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ مسلمان پستی اور زوال کی انتہا کو پہنچ چکے ہیں۔ ان کے حوصلے سرد پڑ چکے ہیں اور وہ راکھ کا ڈھیر بن چکے ہیں لیکن اس مردہ قوم میں تجھ



ایسی بہادر لڑکی کا وجود ہمارے لیے حیرت ہی نہیں خوشی کا باعث بھی ہے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہماری قوم میں تجھ ایسی نیک سیرت اور جذبۂ شجاعت سے سرشار لڑکیاں موجود ہیں جن سے ہمارے سرد حوصلے پھر سے جوان اور تازہ ہو جاتے ہیں۔

ہمیں اس صورتِ حال پر حیران بالکل نہیں ہونا چاہیے۔ تیرا وجود ہمیں اس بات کا پتا دیتا ہے کہ ہمارے بیاباں میں ابھی بہت سے ہرن چھپے ہوئے ہیں اور بادل اگرچہ برس چکا ہے لیکن اس میں ابھی بجلیاں سوئی ہوئی ہیں۔ ملتِ اسلامیہ ابھی مردانِ خدا سے خالی نہیں ہوئی۔ ہم موجودہ حالتِ زار میں بھی جواں مردی کے ایسے معجزے دکھا سکتے ہیں جو دوسروں کی قدرت سے باہر ہیں۔ غیرتِ حق کی چنگاری اس گئے گزرے دور میں بھی بھڑک ہی اٹھتی ہے۔ ابھی تک ہماری قوم میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اللہ کی راہ میں لڑنے اور جان دینے کو بے قرار ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جو ہماری قوم کے مستقبل کی امید ہیں۔

اے فاطمہ! اگرچہ تیرے غم میں ہماری آنکھیں آنسو بہا رہی ہیں لیکن ماتمی فریاد کے ساتھ ساتھ ہمارے دل سے خوشی کے نغمے بھی اٹھتے ہیں۔ ہمیں تیری جدائی کا دکھ تو ہے لیکن اس بات پر بھی خوشی ہے کہ ملتِ اسلامیہ کے اندر ایسی قابلِ قدر لڑکیاں موجود ہیں۔ ہم یہ دیکھ کر خوش ہو رہے ہیں کہ تیری خاک کا ایک ایک ذرہ زندگی کی تڑپ سے بھرا ہوا ہے اور عالمِ مسرت میں رقص کرتا پھر رہا ہے کیونکہ وہ ابھی تک زندگی کے اسی سوز، اسی ولولے اور اسی جوش سے لبریز ہے جو تیرا امتیازی وصف تھا۔ تو نے جس دلیری اور بے باکی سے جامِ شہادت نوش کیا، تیری خاک کا ایک ایک ذرّہ اس دلیری، بے باکی، سرفروشی اور اسلامی جوش و جذبے کی گواہی دے رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری آنکھیں تو تیرے غم میں رو رہی ہیں لیکن ہمارے دل خوشی اور امید کے جذبات سے لبریز ہیں۔

اے فاطمہ! مجھے یقین ہے کہ تیری قبر کی خاموشی کے اندر کوئی ہنگامہ چھپا ہوا ہے اور اس کی گود میں ایک نئی قوم پل رہی ہے۔ اس وقت تو تیری قبر پر سکوت اور خاموشی طاری ہے لیکن مجھے بخوبی اندازہ ہے کہ یہ خاموشی ملتِ اسلامیہ کی بیداری کی علامت ہے۔ اس کی غیرت اور حمیت کے جوش میں آنے کی علامت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس خاموشی کی آغوش سے ایک نئی قوم انگڑائی لے کر بیدار ہورہی ہے جو کچھ عجب نہیں کہ دنیا کو ایک نئے ہنگامے سے دوچار کردے۔

میں اس نئی قوم کے ارادوں اور مقاصد کی وسعت سے تو بے خبر ہوں البتہ یہ ضرور کہتا ہوں کہ ان کا ظہور تیری ہی قبر سے ہوگا۔ اے فاطمہ! تیری شہادت نے مسلمانوں کے جذبۂ عمل ہی کو بیدار نہیں کیا بلکہ ان میں جوش وخروش پیدا کردیا ہے۔ تیری قبر کی خاموش فضا ان میں مقصدیت کا ایسا شعور اور احساس پیدا کرتی ہے جو شاید لمبی لمبی تقریروں، طویل وعظوں اور موٹی موٹی کتابوں سے بھی نہ پیدا ہو سکے۔ تیری قبر ملتِ اسلامیہ کے لیے غیرتِ اسلامی اور شوقِ شہادت کی ایک علامت بن گئی ہے۔

اے فاطمہ! آسمان کی فضا میں ایسے نئے ستارے روشن ہونے والے ہیں جن کی چمک دمک کی لہریں ابھی تک انسان کی آنکھ نے نہیں دیکھیں۔ وہ ستارے ابھی ابھی زمانے کے اندھیروں سے باہر نکلے ہیں۔ ان کی روشنی صبح اور شام کی پابندی سے آزاد ہے۔ یہ صورت نہیں کہ شام ہو تو چمکیں اور صبح ہو تو غائب ہو جائیں وہ ہمیشہ چمکتے رہیں گے۔ ان کی تابانی کے رنگ میں پرانا انداز بھی ہے اور نیا انداز بھی اور ساتھ ہی تیری قسمت کے ستارے کا جلوہ شامل ہے۔ یہ ستارے ملتِ اسلامیہ کی نئی نسل کے قابل اور ہونہار نوجوان ہیں۔ جس طرح نئے ستاروں کی روشنی مدھم ہوتی ہے اور ان کے وجود سے انسان بے خبر ہوتا ہے۔ اسی طرح



قوم ابھی ان ہونہار نوجوانوں کی صلاحیتوں سے ناواقف ہے۔ ان کی یہ صلاحیتیں ابھی اتنی نمایاں نہیں ہوئیں کہ دنیا کو اپنی طرف متوجہ کرسکیں۔ ان ہونہار نوجوانوں نے ظلمت، مایوسی اور تاریکی کی فضا میں جنم لیا ہے مگر ان کے اندر نئے اور پرانے دونوں رنگ موجود ہیں۔ وہ قدیم اور جدید دونوں طرح کے علوم وفنون سے بہرہ ور ہیں۔ اے فاطمہ! ان میں تیری قسمت کے ستارے کا جلوہ بھی چمک رہا ہے۔ تو نے جس دلیری، شجاعت اور سرفروشی کے جذبے سے جان دی، اس کی ایک جھلک ان میں بھی نظر آتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی بدولت اسلام کا نام دنیا میں پھر سے بلند ہوگا۔ ان کے طرزِ عمل میں چوں کہ تیری سرفروشی کا رنگ پایا جاتا ہے، اس لیے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس نئی قوم کا ظہور تیری قبر سے ہوگا۔ یہ نئی قوم ہمارے ماضی کے کارناموں کو بھی زندہ کرے گی، حال کے تمام فرائض سے بھی عہدہ برا ہوگی اور ہمارے مستقبل کی بنیادوں کو بھی مضبوط کرے گی۔ یہی وہ لوگ ہوں گے جو تیرے خوابوں کی تعبیر بنیں گے اور اس مقصد کی تکمیل کریں گے جس کے لیے تو نے اپنی جان کا نذرانہ دیا ہے۔ وہ اسلام کی عظمت کا باعث بنیں گے اور دنیا کی امامت ورہنمائی کا وہ بے مثال فرض ادا کریں گے جو اللہ تعالیٰ نے ملتِ اسلامیہ کے لیے خاص کر رکھا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے اس نظم میں فاطمہ بنتِ عبداللہ نام کی اس گیارہ سالہ عرب لڑکی کے جوش وجذبے کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے جو طرابلس کی جنگ میں غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہوئی تھی۔ یہ جنگ جون ۱۹۱۲ء میں ہوئی تھی جبکہ اٹلی کے بارہ ہزار سپاہیوں نے زوارہ کے مقام پر حملہ کیا تھا۔ مقابلے میں عرب اور ترک صرف تین ہزار تھے۔ یہ لڑائی عصر کے وقت تک جاری رہی تھی اور آخر اٹلی کے سپاہی بارہ سو لاشیں چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔

اٹلی نے طرابلس پر (جسے آج کل لیبیا کہتے ہیں) انگریزوں کی شہ پاکر ستمبر ۱۹۱۱ء میں

حملہ کر دیا تھا۔ طرابلس اس وقت سلطنتِ عثمانیہ کا ایک صوبہ تھا۔ عثمانی سلطنت کے پاس اُس وقت صرف دو بحری جہاز تھے اور دونوں کے دونوں مُرمّت طلب تھے۔ بری فوج صرف مصر کے راستے پہنچ سکتی تھی اور یہ راستہ انگریزوں نے مصر کی ناکہ بندی کر کے روک دیا تھا۔ اس لیے شیخ سنوسی مرحوم نے جو طرابلسی عربوں کے دینی اور سیاسی رہنما تھے۔ اسلام کی عظمت کی خاطر جہاد فی سبیل اللہ کا اعلان کیا۔ ادھر بہادر ترک نوجوان بھیس بدل بدل کر مصر کے غیر معروف راستوں سے گزرتے ہوئے طرابلس پہنچے اور عربوں کو منظم کر کے اٹلی کی فوجوں سے لڑایا۔ ان کی کوششوں سے ترک، عرب اور مصری مل کر اٹلی کے مقابلے پر آ گئے مگر اس بے سروسامانی کی حالت میں کہ نہ توپیں تھیں نہ گولہ بارود، نہ سامانِ رسد کا کوئی سلسلہ تھا اور نہ کمک کی کوئی امید، نہ زندوں کو لباس تھا، نہ مُردوں کے لیے کفن۔ مگر اس کے باوجود انھوں نے غیر معمولی قربانیوں سے کام لے کر اٹلی کی پیش قدمی کو روک دیا۔

فاطمہ بنتِ عبداللہ قبیلہ البراعصہ کے سردار شیخ عبداللہ کی صاحبزادی تھی۔ یہ قبیلہ تعداد اور اثر و رسوخ کے لحاظ سے سب قبیلوں میں بڑا تھا۔ عثمانی سلطنت کے خزانے سے عرب مجاہدوں کو خوراک وغیرہ کے لیے جو رقم ملتی تھی۔ شیخ نے وہ رقم لینے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ اور حقیقی معنوں میں جہاد فی سبیل اللہ کا حق ادا کر دیا تھا۔ ان کے خاندان کے تمام افراد میدانِ جنگ میں شہید ہوئے اور خود شیخ نے بھی شہادت پائی۔

فاطمہ کی عمر صرف گیارہ سال تھی۔ اگرچہ عربوں کی بہت سی عورتیں زخمیوں کی خدمت اور دیکھ بھال کرتی تھیں لیکن فاطمہ ان سب میں کم سن ہونے کی وجہ سے قابلِ ذکر تھی۔ وہ اپنا چھوٹا سا مشکیزہ کندھے پر اٹھائے ہر لحظہ پیاسوں کو پانی پلانے اور زخمیوں کی خدمت بجا لانے میں مصروف رہتی تھی۔ اگرچہ قدم قدم پر گولوں اور گولیوں کی بوچھاڑ تھی لیکن فاطمہ نے شیروں

کا سا دل پایا تھا۔ وہ کسی بھی خطرے سے نہ تو گھبراتی تھی اور نہ خوف کھاتی تھی۔

ظہر کا وقت تھا۔ اطالوی توپیں آگ برسا رہی تھیں۔ فاطمہ کا چہرہ دھوئیں اور تپش سے جُھلسا ہوا تھا۔ بالوں پر سرخی مائل ریت کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ اس کے والد شیخ عبداللہ جنگ میں شریک تھے اور والدہ بھی فاطمہ کی طرح زخمیوں کی دیکھ بھال میں لگی ہوئی تھی۔ عصر کے وقت عرب مجاہدوں کا ایک دستہ اطالویوں پر ٹوٹ پڑا۔ ایک ترک افسر احمد نوری بے بھی اپنے تیس سپاہیوں کو لے کر ساتھ ہو گیا۔ راستے میں ان کا سامنا ایک اطالوی دستے سے ہو گیا جو گھات میں چھپا بیٹھا تھا۔ فاطمہ ترک دستے کے ساتھ تھی۔ اطالویوں نے ترک دستے کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ آخر ترکوں نے جوشِ شجاعت سے کام لیتے ہوئے اپنے لیے راستہ پیدا کر لیا۔ اس کوشش میں ان کے چار بہادر سپاہی زخمی ہو کر گر گئے۔ فاطمہ نے دوڑ کر اپنا مشکیزہ ایک زخمی ترک کے سینے پر رکھ دیا اور چاہتی تھی کہ مشکیزے کا منہ زخمی کے لبوں سے لگا دے۔ اس اثناء میں ایک اطالوی سپاہی نے اسے گریبان سے پکڑ لیا۔ فاطمہ نے اپنے آپ کو بے قابو پا کر بجلی کی سی تیزی سے زخمی ترک کی تلوار اٹھائی اور اس زور سے اطالوی سپاہی پر وار کیا کہ اس کا ہاتھ کٹ کر لٹک گیا۔ فاطمہ پھر اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔ اطالوی سپاہی نے پیچھے ہٹ کر بندوق اٹھائی اور اس معصوم مجاہدہ کو شہید کر ڈالا۔

اپنی تمام بے سرو سامانی کے باوجود زوارہ کے اس معرکے میں تین ہزار عربوں اور ترکوں نے بارہ ہزار اطالویوں کو شکستِ فاش دی اور وہ اپنے بارہ سو سپاہیوں کی لاشیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ جنگ کے بعد عرب اور ترک اپنے زخمی اور شہید ساتھیوں کی تلاش میں نکلے تو اس مقام پر چار بہادر ترک بے ہوش پڑے تھے اور ان کے پاس ہی فاطمہ کی لاش پڑی تھی۔ فاطمہ کا مشکیزہ ترک غازی کے سینے پر پڑا تھا اور مشکیزے کا منہ لبوں پر نہ تھا جس سے معلوم ہوتا تھا

کہ فاطمہ ترک غازی کو پانی پلانے سے پہلے ہی شہید ہوگئی تھی۔

فاطمہ بنتِ عبداللہ کی شہادت کے یہ ولولہ انگیز حالات ۱۳ نومبر ۱۹۱۲ء کے الہلال میں شائع ہوئے تھے۔ حالات کے ساتھ فاطمہ کی ایک رنگین تصویر بھی چھپی تھی۔ الہلال اس زمانے میں جناب ابوالکلام آزاد کی ادارت میں کلکتہ سے شائع ہوتا تھا۔ علامہ اقبالؒ نے اسی واقعے سے متاثر ہو کر یہ نظم لکھی تھی اور فاطمہ بنتِ عبداللہ کے جوش و جذبہ اور شوقِ شہادت کو بھرپور خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے اس توقع کا اظہار کیا تھا کہ ملتِ اسلامیہ دوبارہ سربلندی حاصل کرے گی اور اس کے نوجوان فاطمہ بنتِ عبداللہ کے جذبۂ سرفروشی کی تقلید کرتے ہوئے اپنے بزرگوں کی طرح عظیم الشان کارنامے انجام دیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس پُرجوش خراجِ عقیدت کے ذریعے علامہ اقبال نے اس کم سن مجاہدہ کو حیاتِ ابدی عطا کردی ہے۔ جب تک یہ نظم موجود ہے، فاطمہ بنتِ عبداللہ کا نام مسلمانوں کی روحوں کو تڑپاتا اور دلوں کو گرماتا رہے گا۔





صدیق ؓ

ایک دن رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے فرمایا:

''ہمیں خبر ملی ہے کہ سرحدِ شام کا غسانی بادشاہ جنگِ موتہ کا بدلہ لینے کے لیے خوب تیاری کر رہا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ وہ مدینے پر حملہ آور ہونے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ضروری ہے کہ ہم سرحد شام پر مہم بھیجنے کی غرض سے تیاری کریں۔ تم میں سے جو لوگ مال دار ہیں انھیں چاہیے کہ اپنی ہمت اور توفیق کے مطابق اللہ کی راہ میں مال خرچ کریں۔''

جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فرمان کے ذریعے صحابہ کرامؓ سے جہاد کے لیے مال طلب فرمایا تو تمام صحابہؓ نے اپنی اپنی استطاعت کے مطابق اس کارِ خیر میں حصہ لیا۔ سخت گرمی تھی اور قحط کا زمانہ تھا۔ مدینے کے منافق مسلمانوں کو بہکانے کی کوشش کر رہے تھے کہ قحط پڑا ہوا ہے، گرمی کی شدت ہے، ایسے میں جنگ مناسب نہیں۔ مگر مسلمان منافقوں کی ان باتوں سے حوصلہ ہارنے کی بجائے ہر طرح کی دقت اور دشواری کو برداشت کرتے ہوئے جنگ کی تیاریوں میں لگے رہے۔ حضرت عثمان غنیؓ نے اس کے لیے تین سو اونٹ مع سامان جنگ اور ایک ہزار اشرفیاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیں۔

جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد کے لیے مال طلب فرمایا تو حضرت عمرؓ اٹھے اور خوش خوش گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ اتفاق سے اس روز ان کے پاس کئی ہزار درہم نقد موجود تھے۔ وہ دل میں کہہ رہے تھے کہ اب تک ایسے موقعوں پر حضرت صدیق اکبرؓ اپنے ایثار کی بدولت دوسرے تمام صحابہؓ پر سبقت لے جاتے رہے ہیں لیکن اس بار مجھے یقین ہے



کہ میرا قدم آگے بڑھ جائے گا اور اس دفعہ ایثار و قربانی کے لحاظ سے میں حضرت صدیق اکبرؓ کو ضرور پیچھے چھوڑ جاؤں گا۔ ایسی ہی باتیں اپنے دل میں سوچتے ہوئے وہ گھر پہنچے اور اپنا مال لے کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا۔

ہر کام کا آغاز ایسے ہی ایثار کا محتاج ہوتا ہے۔ ایسی ہی قربانیوں کے طفیل ایمان والوں کے ہاتھوں وہ کارنامے دیکھنے میں آتے ہیں جو دنیا والوں کو حیران کر ڈالتے ہیں۔ ایک شخص کا ایثار دوسروں کو ایثار کی ترغیب دلاتا ہے۔ ایک شخص کی قربانی دوسروں کو قربانی دینے پر آمادہ کرتی ہے۔ اسی طرح چراغ سے چراغ جلتا ہے اور دنیا میں ایمان کا اُجالا پھیلتا ہے۔ جب حضرت عمرؓ نے اپنا مال لاکر سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اے عمرؓ! توحید کا جذبہ، اللہ تعالیٰ کی محبت اور حق کا جوش تیرے دل کے لیے آرام و سکون اور قرار کا باعث ہے۔ یہ وہ کیفیت ہے جو کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔ اور نصیب ہوتی ہے تو کم کم نصیب ہوتی ہے۔ یہ تو بتا کہ تو نے اپنے بال بچوں کے لیے بھی کچھ رکھا ہے یا نہیں؟ ہر مسلمان پر اپنے اہل و عیال، عزیزوں اور رشتہ داروں کا حق ہوتا ہے۔ ایک سچا مسلمان جس طرح ضرورت پڑنے پر اپنی جان اور اپنے مال کو راہِ خدا میں لٹانے کے لیے تیار رہتا ہے، اسی طرح وہ اپنے اہل و عیال، عزیزوں اور رشتہ داروں کا حق ادا کرنے میں بھی کبھی غافل نہیں ہوتا۔ مسلمان جس طرح دوسرے حقوق ادا کرتا ہے اسی طرح اسے اپنے اہل و عیال کا حق بھی ادا کرنا چاہیے۔" حضور کی یہ بات سن کر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا:

"یا رسول اللہؐ! میں نے آدھا مال اپنے بال بچوں کے لیے چھوڑ دیا اور باقی آدھا مال

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل میں ملت پر نثار کر رہا ہوں۔

حضرت عمرؓ کی بات ابھی ختم ہی ہوئی تھی، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ رفیق اور ساتھی حضرت ابوبکر صدیقؓ تشریف لائے جن کے عمل نے عشق اور محبت کی بنیادیں مضبوط کیں۔ جنھوں نے عشق کو عظمت اور محبت کو ابدی صداقت کی رفعت بخشی۔ جن کی فطرت سرتاپا عشق و اخلاص تھی، صدق و صفا تھی اور وفا ہی وفا تھی۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنے ساتھ ہر وہ چیز لے آئے تھے جس کی دنیا میں کوئی قیمت ہو سکتی ہے اور جس کی ملکیت کسی شخص کو دوسروں کی نظروں میں صاحب حیثیت صاحب اعتبار یا صاحب وقار بنا سکتی ہے۔ کنیزیں اور غلام درہم اور دینار، پہننے کے کپڑے، کھانے پینے کی اشیاء، چاند جیسے خوبصورت سُموں والے گھوڑے، اونٹ، خچر اور گدھے، غرض کہ جو کچھ بھی تھا لاکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا۔ یہاں تک کہ کُرتے میں جو بٹن لگے ہوئے تھے وہ بھی اتار کر پیش کر دیے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھ کر فرمایا:

"اے ابوبکرؓ! اپنے بیوی بچوں کے لیے کیا چھوڑ کر آئے ہو؟"

یہ سن کر عشق و محبت کے اس راز دار نے، شمع رسالت کے پروانوں کے سردار نے وہ جواب دیا جو رہتی دنیا تک ایمان والوں کے دلوں کو اپنی روشنی سے جگمگاتا رہے گا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سن کر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جواب دیا۔

"اے وہ پاک ذات جس سے چاند اور تاروں کی آنکھیں روشنی حاصل کرتی ہیں اور جس کی خاطر یہ کائنات پیدا کی گئی ہے۔ جس طرح پروانے کے لیے چراغ اور بلبل کے لیے پھول کافی ہے، اسی طرح صدیقؓ کے لیے اللہ اور اس کا رسولؐ کافی ہے۔"

علامہ اقبالؒ نے اس نظم میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جذبۂ عشق و

اخلاص، صدق و صفا اور سراپا وفا کردار کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ علامہ اقبالؒ خود فرمایا کرتے تھے کہ میں نے حضرت صدیق اکبرؓ کے تمام فضائل ایک مصرعے میں جمع کر دیے ہیں یعنی ؎

ثانی اسلام و غار و بدر و قبر

خود سرکارِ دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں جس کے احسانات کا بدل میں نے نہ کر دیا ہو لیکن ابوبکرؓ کے احسانات کا بدل نہیں کر سکا۔

علامہ اقبالؒ نے اس نظم میں جو واقعہ پیش کیا ہے، وہ ۹ھ ہجری میں جنگ تبوک کے موقع پر پیش آیا تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی خاطر حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ایثار کی داستاں حیرت انگیز حد تک ولولہ انگیز ہے اور عشق رسولؐ کی لازوال کیفیت کی عدیم النظیر مثال ہے۔ انھوں نے کئی ہزار درہم تو ہجرت کے موقع پر حضورؐ کی نذر کیے اور دو مرتبہ اپنے گھر کا سارا ساز و سامان اشاعتِ اسلام کی خاطر حضورؐ کے قدموں میں لا کر ڈال دیا۔ ایک مرتبہ تن کے کپڑے بھی دے دیے اور صرف ایک کمبل اپنے لیے باقی رہنے دیا۔ جب نماز پڑھتے تھے تو کمبل کا ایک بڑا سا کانٹا اس میں لگا لیتے تھے تاکہ رکوع کی حالت میں وہ کمبل شانوں سے سرک نہ جائے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کی یہی شانِ ایثار ہے جسے علامہ اقبالؒ نے اس نظم میں پیش کرکے ہمیں حضرت صدیق اکبرؓ کے فضائل و مناقب کی ذرا سی جھلک دکھائی ہے۔ وہ زندگی بھر رفیقِ نبوت بن کر حضورؐ کے ساتھ رہے تو وفات کے بعد بھی انھیں رفیقِ نبوتؐ ہی کی حیثیت سے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قربت اور رفاقت نصیب ہوئی۔

یہ نصیب اللہ اکبر! لوٹنے کی جائے ہے

بلالؓ

یورپ میں ایک عالم ہو گزرا ہے جسے سچائی کا اندازہ کر لینے میں خاص مہارت حاصل تھی۔ اس کی حق شناسی کی وجہ سے اہل قلم اور اہل علم اس کی بڑی عزت کرتے تھے۔ وہ لکھتا ہے:

”سکندر رومی نے ایشیا میں اپنی فتوحات کے گھوڑے دوڑائے۔ بارہ سال کی قلیل مدت میں اس نے آدھی دنیا کو اپنے گھوڑوں کے قدموں تلے روند ڈالا تھا۔ اسے دوسرے بادشاہوں کے مقابلے میں آسمان سے بھی اونچا مرتبہ حاصل تھا۔ شہنشاہ دارا اور راجہ پورس جیسے حکمران سکندر کے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکے۔ اس کے سامنے کسی کے بھی قدم نہیں جم سکے۔ سکندر ستاروں جیسی فوج رکھنے والا حکمران تھا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ نیلا آسمان بھی اس کی فوج، اس کی شان وشوکت اور اس کے جاہ وجلال کو حیرت اور رشک سے دیکھتا تھا۔ جیسی جنگی کامیابیاں اس نے حاصل کیں وہ اور کسی کے حصے میں نہیں آئیں۔ لیکن دیکھو! آج ایشیا میں کوئی اسے جانتا بھی نہیں۔ تاریخ دانوں کے لیے اسے پہچاننا مشکل ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس نے جتنے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے، جیسی عظیم الشان فتوحات حاصل کیں ان کی بنا پر اس کا ہر جگہ چرچا ہوتا اور اس کا نام بچے بچے کی زبان پر ہوتا لیکن اب اسی کا نام مشکل ہی سے سننے میں آتا ہے۔ اس کے سب کارنامے لوگوں کے دلوں سے حرفِ غلط کی طرح مٹ گئے ہیں اور اب اس کا نام بھی لوگوں کے ذہنوں سے اتر گیا ہے۔

لیکن سکندر کے مقابلے میں ذرا حضرت بلالؓ کو دیکھو۔ وہ ایک معمولی حبشی کے فرزند



تھے۔ ان کی فطرت نے نبوت کے نور سے روشنی حاصل کی۔ وہ اسلام کے موذّن مقرر ہوئے۔ خدا نے یہ امانت ازل کے دن ہی سے حضرت بلالؓ کے سینے میں رکھ دی تھی۔ یہ امانت وہ اذان ہے جسے سن کر بادشاہ اور فقیر دونوں سر جھکا دیتے ہیں۔ یہ وہ اذان ہے جس سے کالے اور گورے، حاکم اور محکوم، غریب اور امیر سب کا فرق مٹ جاتا ہے۔ دل وجگر کو سوز بخشنے والا یہ نغمہ آج بھی تازہ ہے۔ بوڑھا آسمان صدیوں سے اس نغمے کو سن رہا ہے اور قیامت تک سنتا رہے گا۔"

اے اقبالؒ! ذرا سوچ تو سہی! غور تو کر! یہ کس پاک ذات کے عشق کا فیض ہے کہ اس کی برکت سے ایک معمولی حبشی کو ابدی زندگی ملی اور سکندر رومی اپنے عظیم الشان کارناموں کے باوجود مٹ گیا اور اس کا نام بھی لوگوں کو یاد نہ رہا؟

علامہ اقبالؒ نے اس نظم میں ایک طرف تو حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے، دوسری طرف سکندر رومی اور حضرت بلالؓ کا مقابلہ و موازنہ کر کے ہمیں یہ بتایا ہے کہ دنیا کے لیے بڑے بڑے کارنامے انجام دینے والوں کو آج کوئی پوچھتا تک نہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ وہ اپنے کارناموں سمیت لوگوں کے ذہنوں سے اتر جاتے ہیں۔ لیکن اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق کی بدولت حضرت بلالؓ جیسے ایک معمولی حبشی نے وہ مقام پایا ہے جو دنیا میں بڑے بڑے بادشاہوں کو نصیب نہیں ہوا۔ اذان کی بدولت حضرت بلالؓ آج تک لوگوں کو یاد ہیں اور رہتی دنیا تک یاد رہیں گے۔

پھولوں کی شہزادی

ایک دن باغ میں شبنم نے کلی سے کہا۔

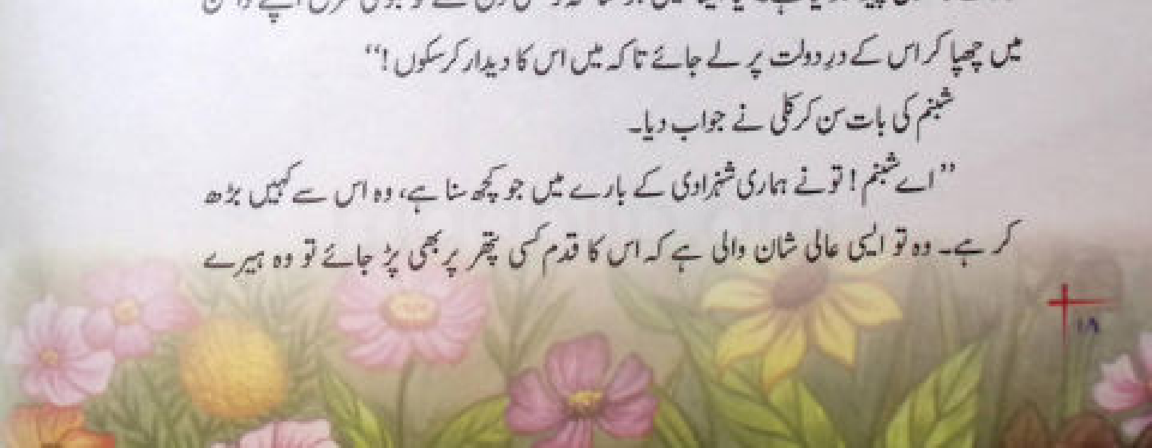
''اگرچہ میں مدتوں جنت میں رہی ہوں اور ایک لمبے عرصے تک میں نے بہشت کے غنچوں کے درمیان زندگی بسر کی ہے لیکن تمھارے باغ کا حسن تو جنت سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اس باغ کی فضا ایسی مست کر دینے والی ہے کہ اس کی تاثیر کی بدولت میری نگاہوں کو ہر طرف جنت ہی جنت نظر آتی ہے۔ اس وجہ سے میں سمجھتی ہوں کہ تمھارے باغ کے سامنے بہشت کی کوئی حیثیت نہیں۔

''میں نے سنا ہے کہ تمھارے باغ کی حاکم کوئی شہزادی ہے۔ سنا ہے کہ وہ شہزادی اگر بیاباں میں چلی جائے تو اس کے قدموں کے نشانات کی تاثیر سے بیاباں میں پھول پیدا ہو جاتے ہیں، ویرانہ باغ میں تبدیل ہو جاتا ہے اور صحرا گلزار کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔''

''اے کلی! تمھارے باغ کی اس شہزادی کی خوبیاں سن سن کر میرے دل میں اس سے ملاقات کا شوق پیدا ہو گیا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تو کسی دن مجھے خوشبو کی طرح اپنے دامن میں چھپا کر اس کے درِ دولت پر لے جائے تاکہ میں اس کا دیدار کر سکوں!''

شبنم کی بات سن کر کلی نے جواب دیا۔

''اے شبنم! تو نے ہماری شہزادی کے بارے میں جو کچھ سنا ہے، وہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ وہ تو ایسی عالی شان والی ہے کہ اس کا قدم کسی پتھر پر بھی پڑ جائے تو وہ ہیرے





جواہرات کی طرح چمکنے لگتا ہے۔ واقعی ہماری شہزادی بڑی خوبیوں کی مالک ہے۔ تیری طرح اور بہت سوں کو اس سے ملنے کی آرزو ہے مگر مشکل یہ ہے کہ تیری فطرت پست واقع ہوئی ہے۔ تو شوخ اور چمکیلی ہے اور ہماری شہزادی بے حد نازک مزاج واقع ہوئی ہے اس لیے تو میری رفیق اور ساتھی بن کر اس کی خدمت میں نہیں پہنچ سکتی۔ ہاں ایک صورت ہو سکتی ہے۔ اگر تو کسی دکھی، غم زدہ اور مصیبت کے مارے کا گرم گرم آنسو بن جائے تو پھر تیری رسائی ہماری شہزادی کے دربار میں ہو سکتی ہے۔ ہماری شہزادی کا دل محبت اور ہمدردی کے جذبات سے لبریز ہے۔ اس کی نگاہ غمزدہ اور سوگوار لوگوں کے لیے مسرت کا پیغام ہے اور اگر اس کے سامنے کسی غم زدہ کی آنکھ سے آنسو ٹپکنے لگیں تو وہ ان آنسوؤں کو موتی بنا دیتی ہے۔

علامہ اقبالؒ نے اس نظم میں پھولوں کی شہزادی کے پردے میں فطرت کی اہم خصوصیت ہمیں بتائی ہیں کہ فطرت ان لوگوں سے محبت اور ہمدردی کا اظہار کرتی ہے جو دکھ درد کے مارے اور غم زدہ ہیں۔ چنانچہ فطرت کی نظروں میں کسی غم زدہ شخص کے آنسو موتیوں سے بھی زیادہ قیمتی ہیں۔



جنگِ یرموک کا ایک واقعہ

۱۵ھ ہجری کی بات ہے یرموک میں دو لاکھ عیسائی فوجی ساز وسامان سے آراستہ میدانِ جنگ میں کھڑے تھے۔ ان کے مقابلے میں مسلمانوں کا لشکر صرف بیس ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھا۔ عرب کے یہ مسلح جوان صفیں باندھے لڑائی کے لیے تیار تھے۔ سرزمینِ شام میں انسانی خون کا دریا بہنے کو تھا۔

اتنے میں ایک نوجوان انتہائی بے چینی اور بے قراری کی حالت میں اسلامی لشکر کے سالار حضرت ابوعبیدہؓ بن جراح کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی۔

"اے ابوعبیدہؓ! میں باقاعدہ جنگ شروع ہونے کا انتظار نہیں کرسکتا۔ شوقِ شہادت نے مجھے سخت بے تاب کر رکھا ہے اور میرے لیے اب مزید صبر اور انتظار کرنا مشکل ہے۔ آپ مجھے جنگ کی اجازت بخشیں اور اکیلے ہی دشمن کی صفوں میں گھس جانے دیں۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جدائی میں بے قرار ہو رہا ہوں اور محبت میں ایک لمحے کے لیے بھی محبوب سے جدا رہنا حرام ہے۔ میں جلد سے جلد حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی جان قربان کر دینا چاہتا ہوں۔ میں یہاں سے سیدھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں جا رہا ہوں۔ اگر آپ سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کوئی پیغام دینا چاہتے ہوں تو دے دیجیے۔ میں خوشی سے بارگاہِ رسالتؐ میں پہنچا دوں گا۔"

نوجوان کی یہ جاں نثاری اور جذبۂ عشقِ رسولؐ دیکھ کر حضرت ابوعبیدہؓ پر رقت طاری ہوگئی۔ ان کی وہ آنکھیں ڈبڈبا آئیں جن کی نظر ننگی تلوار کی طرح تیز تھی اور جن کے سامنے



باطل ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ لشکرِ اسلامی کے اس اونچی شان والے امیر نے نوجوان کی بات سن کر کہا:

"اے نوجوان! عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت تیرا مرتبہ اس قدر بلند ہو گیا ہے کہ بوڑھوں کو بھی تیری عزت کرنی لازم ہے۔ تیرا عشق حد درجہ قابلِ احترام ہے اس لیے کہ تیرے عشق کا مقام نہایت اونچا ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا خدا تیرے دل کی مراد پوری کرے اور جس سعادت کی تجھے آرزو ہے وہ سعادت تجھے نصیب ہو۔ جب تو رسولِ امین صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہِ اقدس میں پہنچے تو میری طرف سے سلام کے بعد عرض کرنا:

"خدا تعالیٰ کا فضل و کرم ہمارے شاملِ حال ہے۔ ہمارے غیور خدا نے ہم پر کرم کیا ہے۔ حضورؐ نے فتح و نصرت کے متعلق جو جو وعدے فرمائے تھے، وہ سب کے سب ہماری آنکھوں کے سامنے پورے ہو رہے ہیں۔

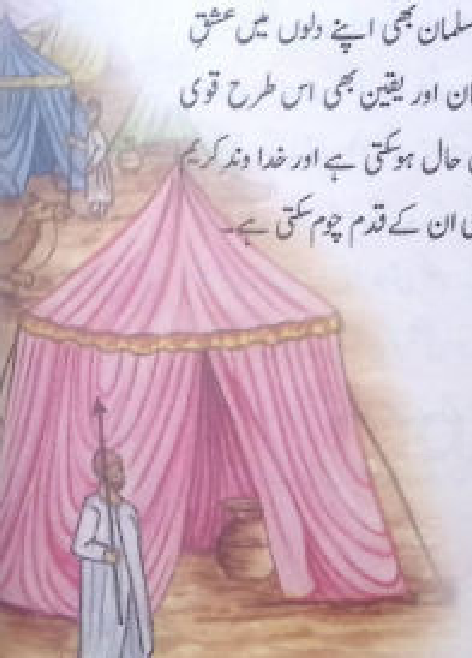
علامہ اقبالؒ نے اس نظم میں ایک مومن کے شوقِ شہادت کا ولولہ انگیز تذکرہ کیا ہے۔ جنگِ یرموک عہدِ فاروقیؓ کی فیصلہ کن جنگوں میں سے تھی جس میں بیس ہزار مسلمانوں نے دو لاکھ رومیوں کو شکستِ فاش دی تھی۔ جس طرح قادسیہ کی جنگ کے بعد ایرانی سلطنت کا زور ختم ہو گیا تھا۔ اسی طرح یرموک کی جنگ کے بعد رومیوں کے حوصلے پست ہو گئے تھے اور سارا ملکِ شام مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا تھا۔ اس تاریخی اور فیصلہ کن جنگ میں حضرت ابو عبیدہؓ بن جراح اسلامی لشکر کے سالار تھے۔ ان کا شمار "عشرہ مبشرہ" یعنی ان دس اصحابِ رسولؐ میں ہوتا ہے جن کو جنتی ہونے کی بشارت ان کی زندگی ہی میں حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے دے دی تھی۔ حضرت ابو عبیدہؓ کی بہادری کے ڈنکے تمام عرب میں بجے ہوئے تھے۔ وہ ہر معرکے میں حضورؐ کے ساتھ رہے۔ جنگِ احد میں انھوں نے اپنی شجاعت کے جوہر

پورے طور پر دکھائے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی حاصل کی۔ حضرت عمرؓ نے انھیں سپہ سالار بنا کر شام بھیجا تھا اور وہ فتح مبین حاصل کر کے "فاتح شام" کے لقب سے سرفراز ہوئے۔

جنگِ یرموک سے یہ بات ایک بار پھر روزِ روشن کی طرح واضح ہوگئی کہ جنگ میں سپاہیوں کی تعداد کی بجائے ایمان اور یقین کو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے۔ مسلمانوں کو یقین ہوتا تھا کہ وہ اللہ کی راہ میں لڑ رہے ہیں اس لیے وہ موت سے نہیں ڈرتے تھے بلکہ وہ شہادت کی آرزو دل میں لیے ہوئے میدانِ جنگ میں اترتے تھے۔

علامہ اقبالؒ نے اس نظم میں اس مسلمان نوجوان کا تذکرہ کیا ہے جس کا جذبہ و شوقِ شہادت دوسروں سے کہیں زیادہ تھا اور وہ شہادت کا مرتبہ پا کر بارگاہِ رسالتؐ میں حاضری کے لیے اس قدر بے قرار تھا کہ اُس کے لیے باقاعدہ جنگ شروع ہونے کا انتظار بھی دشوار تھا۔

عہدِ فاروقیؓ کے اس نوجوان مجاہد کے شوقِ شہادت کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ ہمیں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اگر موجودہ دور کے مسلمان بھی اپنے دلوں میں عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی رنگ پیدا کرلیں اور ان کا ایمان اور یقین بھی اس طرح قوی ہوجائے تو آج بھی اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت ان کے شاملِ حال ہوسکتی ہے اور خداوندِ کریم کے لطف و کرم سے زندگی کے ہر شعبے میں کامیابی اور فتح مندی ان کے قدم چوم سکتی ہے۔



حکایاتِ بالِ جبریل

نہیں۔ یہ تیرے مجاہد بندے بھی نہ مالِ غنیمت چاہتے ہیں اور نہ انھیں ملک فتح کرنے کی آرزو ہے۔ وہ طلب گار ہیں تو صرف شہادت کے طلب گار ہیں کہ تیرے نام پر لڑتے لڑتے جان دے دیں۔ یورپ کی سرزمین کب سے ان کی راہ دیکھ رہی ہے کہ کب یہ مجاہد آئیں اور اپنے عربی خون کا نذرانہ دے کر اس سرزمین میں توحید کا پرچم بلند کریں۔

اے اللہ! یہ تیرا کرم تھا کہ تُو نے ان صحرا کی گود میں پرورش پانے والوں کو اسلام کی نعمت سے سرفراز کر کے انھیں علوم وفنون، قوتِ ایمانی اور ذوقِ عبادت کے لحاظ سے بے مثال و بے نظیر بنا دیا۔ زندگی کو جس سوز اور تڑپ کی صدیوں سے طلب تھی وہ سوز اور تڑپ اسے انھی مجاہدین کے جگر میں ملی ہے۔ انسانیت کو صدیوں سے کسی ایسے نظام کی تلاش تھی جو زندگی کو زندگی کے صحیح مقصد سے آشنا کرے اور انسانیت کو اس کا صحیح مقام دلائے۔

یہ بات اسلام نے عربوں کے سینوں میں بھر دی اور پھر دنیا کو زندگی کا قرینہ سکھانے کا کام عربوں ہی نے انجام دیا۔ اور کوئی قوم یہ کام نہیں کر سکی۔ یہ دنیا کو زندگی کے آداب سکھانے والے بھی مجاہد ہیں۔ یہ وہ مجاہد ہیں جو موت کو موت یا ہلاکت نہیں بلکہ دل کا دروازہ کھلنے اور دلی مراد برآنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ موت کو ہلاکت وہی سمجھ سکتے ہیں جنھیں موت کے بعد آخرت کی ہمیشہ رہنے والی زندگی پر یقین نہ ہو۔ جس قوم کے لیے اس دنیا کی زندگی آخرت کی زندگی کی کھیتی ہے اسے موت کیوں کر ڈرا سکتی ہے؟ اس کے لیے موت دلی مراد حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ اسی لیے یہ مجاہد موت کو موت نہیں بلکہ ایک عظیم نعمت خیال کرتے ہیں۔

اے باری تعالیٰ! تو اپنی رحمت سے مردِ مومن کے دل میں پھر اسی بجلی کو زندہ کر دے جو حضرت نوح علیہ السلام کے نعرۂ لَا تَذَرْ میں تھی تا کہ کفر کی ساری قوتیں جل کر راکھ ہو جائیں اور دنیا میں خدا کا کوئی ایک منکر بھی باقی نہ رہے۔ اے خدا! جس طرح حضرت نوحؑ

کی دُعا کے نتیجے میں تُو نے کسی کافر کو بھی روئے زمین پر باقی نہیں چھوڑا تھا، اسی طرح اب ان مجاہدوں کے ہاتھوں دنیا سے کفر کی تاریکیوں کو مٹا دے اور اسے ایمان کے نُور سے بھر دے۔

اے باری تعالیٰ! ان مجاہدوں کے سینوں میں جو عزم، حوصلے اور ولولے سوئے پڑے ہیں، انھیں بیدار کردے تاکہ وہ پھر تیری رضا کے حصول کی خاطر عظیم الشان مقاصد کے لیے سرگرمِ عمل ہو جائیں اور ان کی نگاہوں میں تلوار کی سی تیزی پیدا کر دے تاکہ وہ جدھر پڑے، باطل کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے اور اس طرح تیرے یہ مجاہد دنیا میں تیرا بول بالا کرسکیں اور حق کو انتہائی سربلندی پر پہنچا سکیں۔

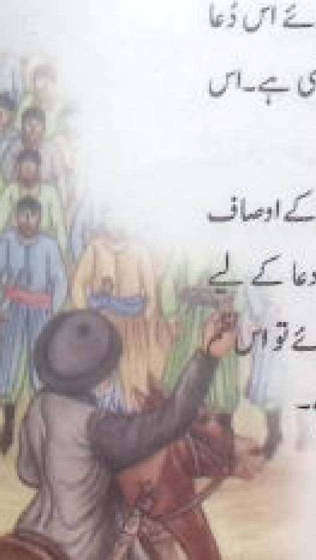
علامہ اقبالؒ نے اس ولولہ انگیز نظم میں نامور اسلامی فاتح طارق بن زیاد اور اُس کے ہمراہی مجاہدوں کے جذبۂ ایمانی اور اللہ کی راہ میں ولولۂ جہاد اور شوقِ شہادت کو بیان کیا ہے کہ مسلمان اللہ کے راستے میں لڑتے ہوئے کسی رکاوٹ کو خاطر میں نہیں لاتا۔ وہ غازی کی حیثیت سے جینا اور شہید کی حیثیت سے دُنیا سے رخصت ہونا اپنی زندگی کا مقصد سمجھتا ہے اور موت اس کے لیے موت نہیں بلکہ دلی مُراد برآنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

طارق بن زیاد نسلی اعتبار سے بربر تھے۔ جب بربر قبائل نے اسلام قبول کیا تو طارق کے والد مسلمان ہوئے اور اُنھوں نے دمشق میں سکونت اختیار کرلی۔ سلطنتِ بنواُمیہ کے مشہور سپہ سالار موسیٰ بن نصیر نے طارق کو اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ خلیفہ ولید کے عہد میں موسیٰ بن نصیر شمالی افریقہ کا گورنر بنا۔ اُندلس سے کچھ لوگوں کی ایک جماعت اس کے پاس راڈرک شاہِ ہسپانیہ کے ظلم وستم کی شکایت لے کر آئی تو موسیٰ بن نصیر نے مجاہدین کی ایک چھوٹی سی جمعیت ہسپانیہ بھیج دی جو ساحلی جزیروں پر حملوں کے بعد لوٹ آئی۔ پھر مستقل حملے کا فیصلہ ہوا اور

طارق بن زیاد کو سات ہزار مجاہدوں کے ساتھ اسپین پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ طارق کے پاس چار جہاز تھے جنھوں نے کئی چکروں میں اسلامی فوج کو افریقہ سے ہسپانیہ پہنچایا۔ آخری چکر میں طارق خود گیا اور اُس نے اسپین کے ساحل پر اترتے ہی جہاز جلانے کا حکم دیا تاکہ کسی مجاہد کو واپسی کا خیال تک نہ رہے اور وہ عزیمت کے پیکر اسپین کی مہم کو سر کر کے ہسپانیہ میں اپنے لیے جگہ پیدا کریں۔

ابتدا میں چند معمولی جھڑپیں ہوئیں۔ طارق آہستہ آہستہ آگے بڑھتا گیا پھر شاہ راڈرک تقریباً ایک لاکھ فوج لے کر مقابلے پر آیا۔ تین روز تک جنگ جاری رہی۔ طارق کے مجاہد غریب الوطن تھے اور اجنبی ملک میں لڑ رہے تھے۔ راڈرک اپنے ملک میں تھا اور تمام ملکی وسائل اُس کے قبضے میں تھے۔ اس کے باوجود اُس نے شکستِ فاش کھائی۔ وہ میدانِ جنگ سے بھاگ نکلا لیکن دریا میں ڈوب کر مر گیا۔

جنگ شروع ہونے سے پہلے طارق بن زیاد نے مجاہدین کے سامنے ایک پُر جوش تقریر کی اور اسلامی روایات کے مطابق اللہ تعالیٰ سے فتح و کامرانی کے لیے دُعا مانگی۔ علامہ اقبالؒ نے طارق کے حملے کے مقصد، اُس کے کردار اور دیگر باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس دُعا کا تصور کیا اور اُسے اِس نظم کا روپ دے دیا جو ہر دور کے مسلمان مجاہد کی آرزو رہی ہے۔ اس لحاظ سے یہ اشعار ہر مسلمان کے دل کی آواز ہے۔



اِس نظم میں ایک طرف تو اللہ کے راستے میں لڑنے والے مجاہدین اور اُن کے اوصاف و خصائل کا ذکر نہایت ولولہ انگیز اور جوشیلے انداز میں کیا گیا ہے۔ دوسری طرف دعا کے لیے انتہائی عاجزی اور انکساری کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ نظم کی ان خوبیوں کو دیکھا جائے تو اس کو دُعا ہونے کے ساتھ ساتھ بجا طور پر ایک مسلمان مجاہد کا ترانہ بھی کہا جاسکتا ہے۔

جاوید کے نام

اے میرے بیٹے! تجھے جان لینا چاہیے کہ خودی کی ترقی ہی میں ہمیشہ رہنے والی زندگی کا نشان مل سکتا ہے اور قوموں کی اقبال مندی کے چراغ خودی ہی کی حرارت سے جلتے اور روشن ہوتے ہیں۔ یہ خودی ہی ہے جو افراد کو جاودانی عطا کرتی ہے اور یہ خودی ہی کا جذبہ ہے جس کی بدولت دُنیا کی قومیں عروج اور سربلندی پاتی ہیں۔

اگر آدمی کے دل میں یہ احساس ہو کہ وہ اس دُنیا میں ایک اہم مقصد لے کر آیا ہے۔ تو یہی ایک بات اُس کے لیے ہزار قسم کی ترقیوں اور ہزار قسم کے اطمینان کا باعث بن جاتی ہے۔ انسان کی قدر و قیمت اس کے لباس، اس کی دولت، اس کے ساز و سامان یا اس کے عہدہ اور منصب پر موقوف نہیں۔ دنیا میں ہزاروں آدمی بڑے بڑے دولت مند، جاگیردار، منصب دار، اور عہدے دار گزرے ہیں لیکن انھیں کوئی جانتا بھی نہیں۔ اس لیے کہ ان کے سامنے زندگی کا کوئی مقصد نہ تھا۔ لیکن جس کے سامنے کوئی مقصد ہو، وہ ہر ساز و سامان، ہر جاگیر، ہر عہدے اور ہر منصب سے بے نیاز ہو جاتا ہے، اس لیے تجھے بھی اپنے لیے کوئی نصب العین تجویز کر لینا چاہیے۔

کیا تو نے اس کوے اور شاہین کی حکایت نہیں سُنی جو اتفاق سے ایک جگہ اکٹھے اور مل جل کر رہنے لگے تھے۔ شاہین کی صحبت سے کوے میں تو اُونچا اُڑنے کی ہمت اور صلاحیت پیدا نہ ہو سکی لیکن کوے کی صحبت نے شاہین کی عادتیں بگاڑ دیں۔ سو تجھے یہ جان لینا چاہیے کہ ناجنس کی صحبت میں اٹھنا بیٹھنا کبھی اچھا نتیجہ پیدا نہیں کرتا۔ ایسی صحبت سے ہمیشہ بچنا



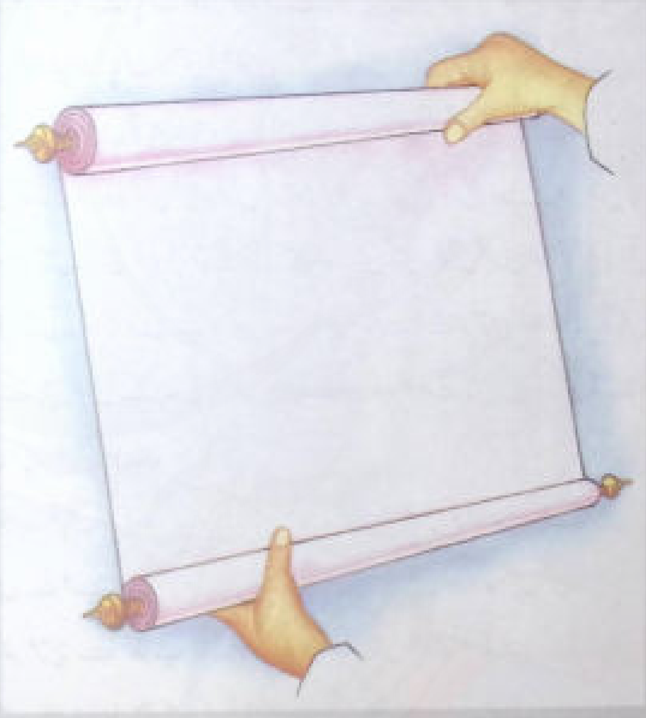
چاہیے۔

زمانہ بے حیائی کے راستے پر چل نکلا ہے اور اس کی آنکھ شرم و حیا کے جوہر سے خالی ہو چکی ہے۔ جس آنکھ میں شرم و حیا باقی نہ رہی ہو اس سے کسی پاک بازی اور پاک دامنی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ یاد رکھ کہ حیا ایمان کا ایک جزو ہے اور ایسا جزو ہے جس کے بغیر ایمان کامل نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس لیے میری دُعا ہے کہ خدائے بزرگ و برتر تیری جوانی کے دامن کو بُرائی کے ہر داغ سے پاک اور محفوظ رکھے۔ تو نیک اور صالح جوان بنے۔ ایسا نیک صالح جوان جس کی حیا اور پاک دامنی فرشتوں کے لیے بھی باعث رشک ہو۔

اقبال نے یوں تو بہت سی خانقاہوں کو دیکھا ہے لیکن اُس کے لیے کسی خانقاہ میں ٹھہرنا ممکن نہیں تھا۔ کیونکہ وہ خوش طبع، خوش فکر اور صاحب ذوق واقع ہوا ہے اور اس کا دماغ شگفتہ ہے، پژمردہ نہیں۔ آج کل کی خانقاہوں میں تو خوش طبعی، خوش فکری اور خوش ذوقی نام کی کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ خانقاہوں کے ماحول میں ان صفات کو پسند نہیں کیا جاتا۔ وہاں تو ایسے ہی لوگ رہ سکتے ہیں جن کے دماغ خشک ہوں، نہ اُن کی طبیعت میں کبھی شگفتگی آئے اور نہ انھیں کبھی کوئی اچھا خیال سوجھے۔

علامہ اقبالؒ نے یہ نظم اپنے عزیز فرزند جاوید اقبال کو مخاطب کر کے لکھی ہے۔ اس نظم میں اُنھوں نے اپنے فرزند عزیز کے لیے نصیحتیں بھی کی ہیں اور دعائیں بھی۔ انھوں نے اگرچہ اپنے فرزند عزیز سے خطاب کیا ہے لیکن حقیقت میں ملتِ اسلامیہ کے تمام نوجوان اُن کے مخاطب ہیں۔ اور وہ چاہتے ہیں کہ ملتِ اسلامیہ کا ہر نوجوان اپنی خودی کو پروان چڑھائے، اپنی زندگی کا نصب العین اور مقصد متعین کرے اور پھر اپنی ساری صلاحیتیں اس مقصد کے حصول کے لیے وقف کر دے۔

وہ کوّے اور شاہین کی مثال دیتے ہوئے صحبت ناجنس سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں اور پھر جاوید اور ہر نونہالِ ملت کے لیے یہ دعا بھی کرتے ہیں کہ اس کی جوانی کا دامن برائی کے ہر داغ سے محفوظ رہے، اس لیے کہ شرم و حیا سے عاری زمانے کے درمیان زندگی بسر کرتے ہوئے پاک بازنگاہ اور پاک دامن جوانی سے بڑھ کر اور کوئی جوہر نہیں ہوسکتا۔





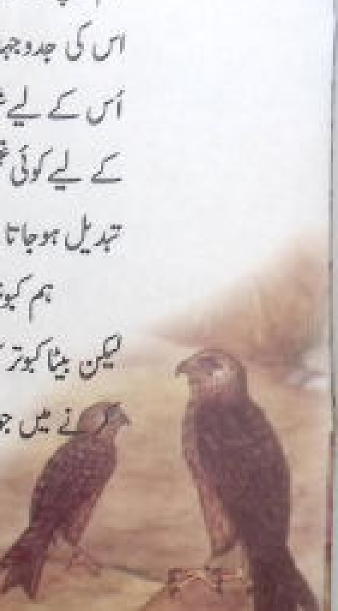
نصیحت

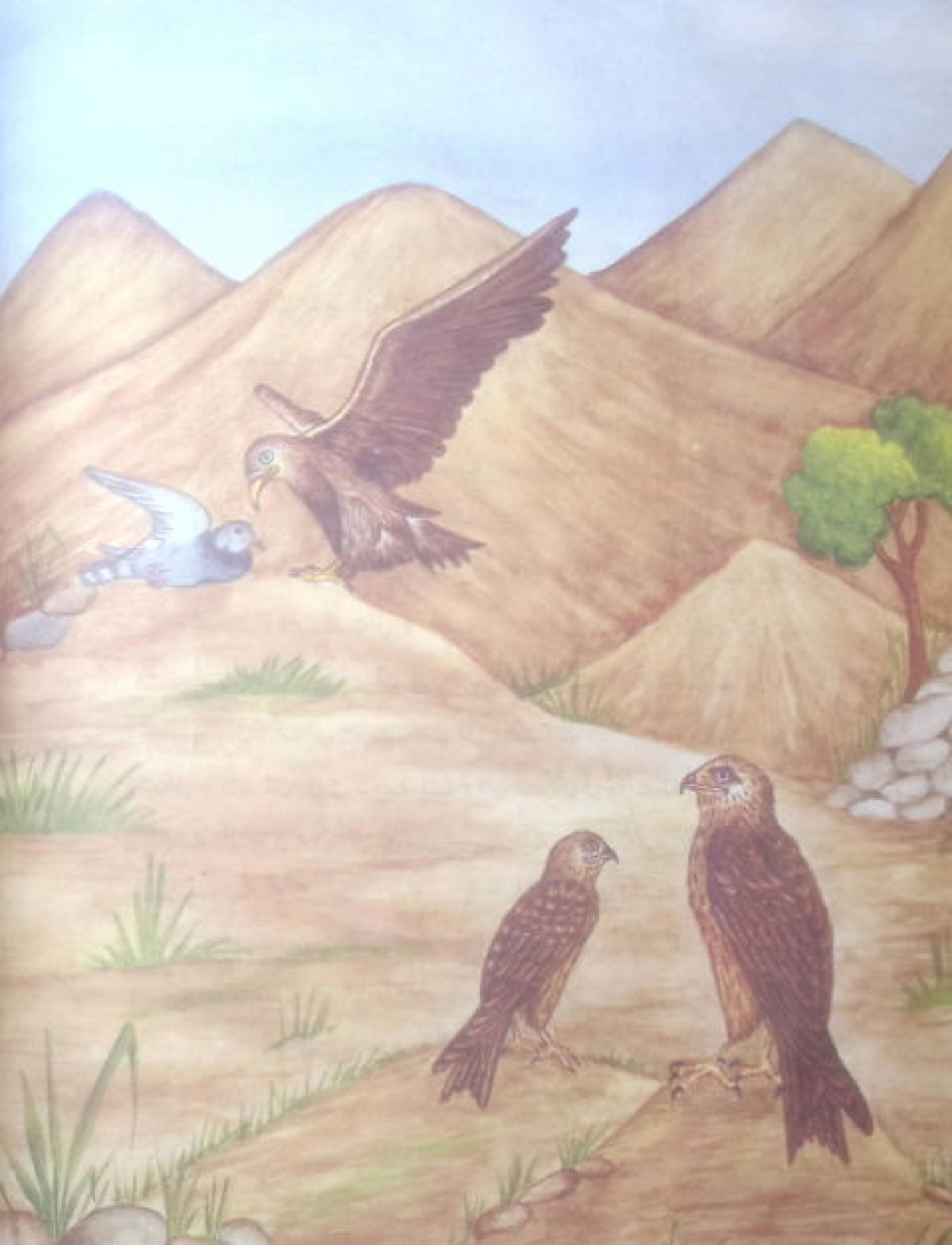
ایک بوڑھے عقاب نے شاہین کے بچے سے کہا۔

"اے بچے! خدا تیرے بازوؤں میں ایسی قوت عطا کرے جس کی برکت سے تیرے لیے آسمانوں کی بلندیوں تک اُڑنا بھی آسان ہو جائے۔ تیرے پروں کو ایسی طاقتِ پرواز نصیب ہو کہ چرخِ بریں کی رفعت تیرے لیے رفعت نہ رہے اور آفاق کی وسعت تیرے لیے وسعت نہ رہے۔

مجھ سے سُن کہ شباب کسے کہتے ہیں اور جوانی کا مطلب کیا ہے؟ شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام ہے۔ جوانی کا مطلب یہ ہے کہ تُو لگاتار محنت اور مشقت کرتا رہے اور تیرے خون کی حرارت تجھے ہر وقت جدوجہد میں لگائے رکھے۔ اسی کو شباب کہتے ہیں۔ اسی کا نام اپنے لہو کی آگ میں جلنا ہے۔ جب کوئی ہر وقت محنت اور مشقت میں مصروف رہے اور اس کی جدوجہد میں کبھی کمی نہ آنے پائے تو اس سخت کوشی کی بدولت زندگی کی ساری تلخیاں اُس کے لیے شہد کی طرح میٹھی بن جاتی ہیں۔ اس کے لیے کوئی مشکل، مشکل نہیں رہتی۔ اُس کے لیے کوئی غم، غم نہیں رہتا۔ اُس کا ہر دُکھ، سُکھ بن جاتا ہے۔ اس کا ہر رنج، راحت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور یہ اس وجہ سے کہ وہ اپنی جدوجہد سے ایک خاص لطف اٹھاتا ہے۔

ہم کبوتروں کا شکار بھی کرتے ہیں اور اُن کے خُون سے اپنی پیاس بھی بُجھاتے ہیں لیکن بیٹا کبوتر کا شکار ہمارے لیے لہو گرم رکھنے کا ایک بہانہ ہے۔ کبوتر پر جھپٹنے اور اس پر حملہ کرنے میں جو مزا ملتا ہے، وہ مزا تو شاید کبوتر کا لہو پینے میں بھی نہیں ہے۔ اس لیے کہ زندگی کا





اصل لطف تو جدوجہد میں ہے۔ ہماری زندگی کا حقیقی مزا تو شکار پر جھپٹنے، پلٹنے اور پلٹ کر جھپٹنے میں ہے۔ شکار کا لہو پینے میں وہ مزا وہ لذت بھلا کہاں؟

علامہ اقبالؒ نے اس نظم میں ہمیں جفاکشی اور جدوجہد کی تعلیم دی ہے بوڑھے عقاب کی طرف سے شاہین کے بچے کو نصیحت کے پیرائے میں انھوں نے ہمیں زندگی کی ایک بہت بڑی حقیقت سے آگاہ کیا ہے۔ وہ حقیقت یہ ہے کہ زندگی کا اصل لطف جدوجہد میں ہے۔ زندگی کا حقیقی مزا وہی لوگ لیتے ہیں جو مسلسل جدوجہد کرتے ہیں۔ اُن کے لیے زندگی کی کڑواہٹ شہد بن جاتی ہیں۔ اُن کے لیے کوئی مشکل، مشکل اور کوئی رکاوٹ، رکاوٹ نہیں رہتی۔ وہ اپنی مسلسل جدوجہد سے ہر مشکل کو آسان اور ہر رکاوٹ کو دور کرتے چلے جاتے ہیں۔ زندگی کی یہی مسلسل جدوجہد اُن کے لیے لطف اور لذت کا سامان بن جاتی ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک جدوجہد میں جو لذت ہے، وہ جدوجہد سے حاصل کی ہوئی چیزوں میں نہیں۔



اذان

ایک رات صبح کے ستارے نے آسمان پر چمکتے ہوئے دوسرے ستاروں سے پوچھا۔

"یہ تو بتاؤ کیا تم نے انسان کو بھی رات کے وقت یا اس آخری حصے میں جاگتے ہوئے دیکھا۔ میں رات کے آخری حصے میں طلوع ہوتا ہوں اور اس وقت میں نے انسان کو سوتے ہوئے ہی پایا ہے۔ تم ساری رات چمکتے رہتے ہو اس لیے مجھ سے بہتر جانتے ہو گے۔ اسی لیے میں تم سے پوچھ رہا ہوں کہ کیا تم نے انسان کو رات کے وقت بیدار دیکھا ہے؟"

صبح کے ستارے کی بات سُن کر مریخ ستارے نے جواب دیا۔

"قضا و قدر کا کام جن فرشتوں کے سپرد ہے، وہ حقیقت کو خوب پہچانتے ہیں۔ انھوں نے یہی مناسب سمجھا کہ رات کے وقت اس چھوٹے سے فتنے کا سویا رہنا ہی بہتر ہے۔ یہ تو دن کے وقت ہی ہزاروں ہنگامے برپا کیے رکھتا ہے۔ اگر رات کو جاگ اٹھے تو خدا جانے کیا قیامت برپا کرے؟"

زہرہ ستارے نے یہ بات چیت سُنی تو بیزاری سے کہا۔

"کیا تمھیں گفتگو کے لیے کوئی اور موضوع نہیں ملتا؟ انسان سے ہمیں کیا سروکار؟ اس کی حیثیت تو اس کیڑے کی سی ہے جسے رات کے وقت کچھ سجھائی نہ دیتا ہو۔ پھر وہ رات کو کیوں جاگے؟"

مریخ اور زہرہ کی یہ باتیں سن کر چودھویں رات کے چاند نے کہا۔

"دوستو! تمھاری باتوں سے بے تعلقی ظاہر ہوتی ہے۔ مریخ نے انسان کو فتنہ [illegible]



ہے اور زہرہ کا کہنا ہے کہ ہمیں اس سے واسطہ ہی نہیں لیکن حقیقت کیا ہے وہ میں تمھیں بتاتا ہوں۔ تم تو زمین سے دور ہو اس لیے تمھیں وہاں کے معاملات کی کوئی خبر نہیں جبکہ میں زمین کا پڑوسی ہوں اور مجھے زمین کے معاملات سے پوری آگاہی حاصل ہے۔ سنو! جس طرح تم آسمان کے ستارے ہو، اُسی طرح انسان زمین کا ستارہ ہے۔ تم رات کو نمودار ہوتے ہو، وہ دن کو نمودار ہوتا ہے۔ تم رات کے اندھیرے میں چمکتے ہو، وہ دن کے اُجالے میں اپنی جدوجہد کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ اگر انسان رات کو جاگنے کی لذّت سے آگاہ ہو جائے، اگر وہ یہ جان لے کہ رات کے وقت کی عبادت سے کیسے کیسے اور کیا کیا فیض حاصل ہوتے ہیں تو یہ مٹھی بھر خاک جس کے اندر خدا جانے کیا کیا راز بھرے ہوئے ہیں، ثریا سے بھی اونچا مقام حاصل کر لے۔ اس کی آغوش میں وہ نور لہریں لے رہا ہے کہ وہ ظاہر ہو جائے تو آسمان کے تمام ستارے اور سیارے اُس کی جلوہ باریوں میں گم ہو کر رہ جائیں۔"

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اچانک فضا میں اذان کی آواز گونجی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کائنات کی ساری فضا اسی آواز سے بھر گئی ہے۔ یہی وہ نعرہ ہے جسے سُن کر پہاڑوں کے بھی دل دہل جاتے ہیں۔ گویا انسان کو اذان کی صورت میں بیداری کا خدائی پیغام مل گیا۔

علامہ اقبال نے اس نظم میں شب بیداری اور رات کی خاموشی میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کے ذوق و شوق کی فضیلت نہایت مؤثر انداز میں بیان فرمائی ہے۔ نظم کا آغاز ستاروں کی بات چیت سے ہوتا ہے جو اپنے سوال و جواب میں انسان کے رات کے وقت سوئے رہنے کا ذکر کرتے ہوئے گویا اس کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔ چاند کی زبانی علامہ اقبالؒ نے یہ کہلوایا ہے کہ اگر اپنی ذاتی تجلّی کو بے نقاب کر سکے تو آسمان کے تمام ستارے اور سیارے اس کی چمک دمک کے سامنے ماند پڑ جائیں۔ یعنی انسان ہی اس کائنات کی سب سے بڑی اور اشرف المخلوقات

ہستی ہے اور اگر یہ ہستی رات کے وقت جاگنے اور عبادت کرنے کی لذّت سے آگاہ ہو جائے تو اس کی خاک کا مرتبہ ثُریا سے بھی اُونچا ہو سکتا ہے۔

نظم کا آخری شعر اذان پر ختم ہوتا ہے کہ رات کی خاموشی کو چیرتے ہوئے اذان کی وہ آواز فضا میں گونج جاتی ہے جسے سُن کر پہاڑوں کے بھی دل دہل جاتے ہیں۔ یہ وہ آواز ہے جو مسلمان کے لیے بیداری اور عبادت کی دعوت کا مؤثر ترین پیغام ہے۔ یہی وہ آواز ہے جسے سُنتے ہی وہ اپنا عیش و آرام، اپنا کاروبار، اپنی پسند، غرض کہ اپنا سب کچھ چھوڑ کر اللہ کی عبادت کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔





پرواز

ایک روز ایک درخت نے جنگل کے ایک پرندے سے کہا۔

"مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دُنیا کی بنیاد سراسر ظلم اور بے انصافی پر رکھی گئی ہے۔ قدرت نے تجھے بال و پَر بخشے ہیں لیکن مجھے بال و پَر سے محروم رکھا ہے۔ اگر خدا مجھے بھی بال و پَر عطا کر دیتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ جس طرح تو فضاؤں میں پرواز کرتا پھرتا ہے، اسی طرح میں بھی پرواز کیا کرتا۔ دُنیا والے جب ایک درخت کو پرندوں کی طرح پرواز کرتے دیکھتے تو کتنا خوش ہوتے! مجھے یقین ہے کہ اس طرح دنیا کی رونق، چہل پہل اور دلکشی کچھ اور بڑھ جاتی۔ اہلِ دنیا کی دلچسپیوں میں اور اضافہ ہو جاتا۔"

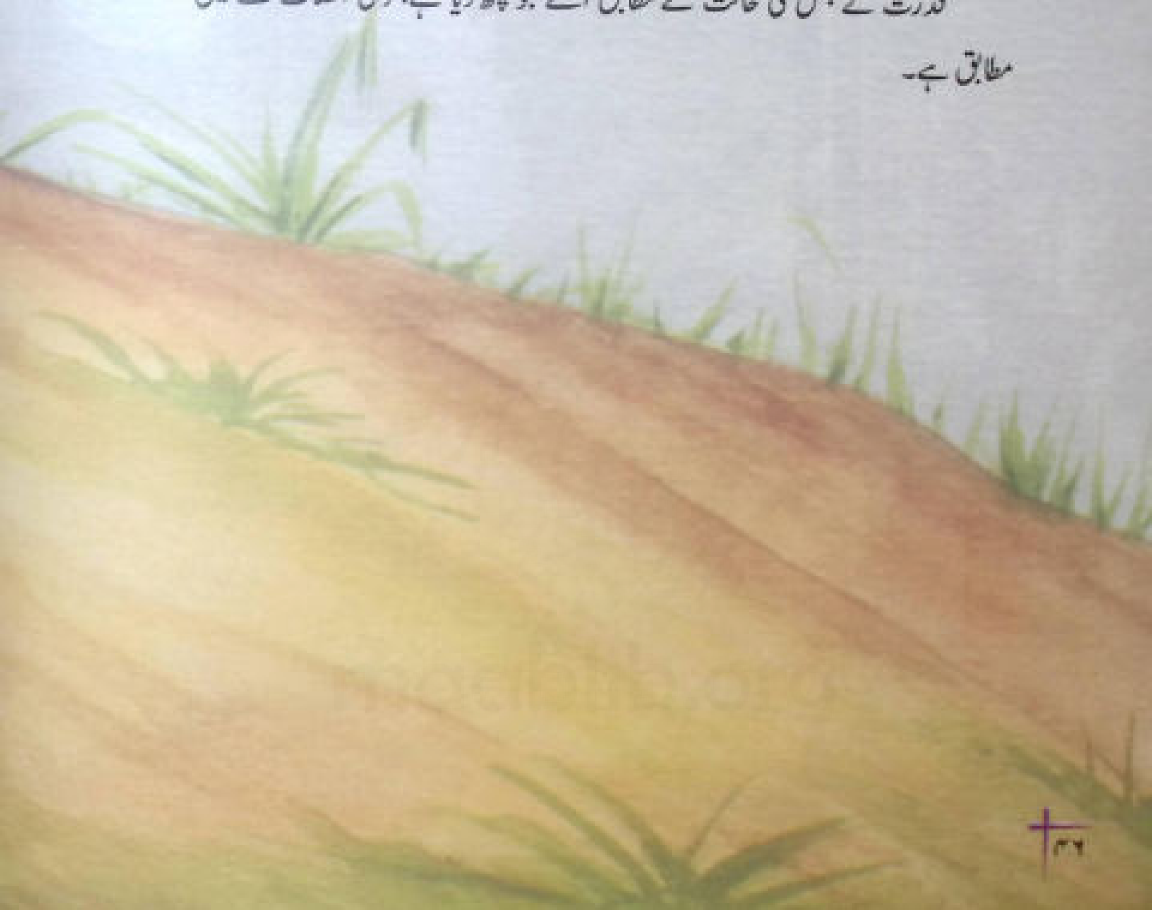
درخت کی یہ بات سُن کر جنگل کے پرندے نے جواب میں کہا۔

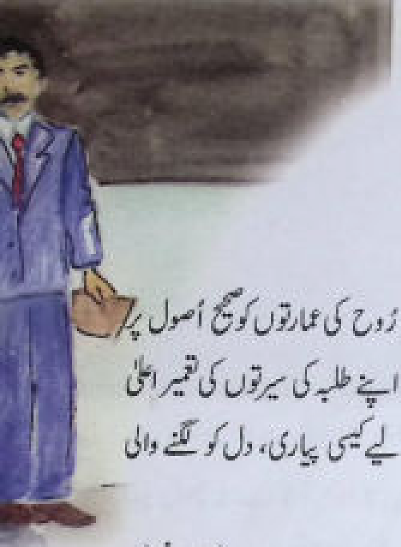
"یہ کیا غضب ہے کہ تُو نے انصاف کو ظلم اور داد کو بے داد سمجھ رکھا ہے۔ جان لے کہ اس دُنیا کی بنیاد ظلم اور بے انصافی پر نہیں، عدل اور انصاف پر رکھی گئی ہے۔ اس دُنیا میں پرواز کی لذّت حاصل کرنے کا اُسے کوئی حق نہیں ہے جس کا وجود مٹی کی کشش سے آزاد نہیں ہے۔ تیری حالت یہ ہے کہ تو مٹی میں گڑا ہوا ہے۔ تیری جڑیں اس مٹی میں دُور دُور تک پھیلی ہوئی ہیں تو اس مٹی کی کشش سے نجات حاصل نہیں کرسکتا۔ ایسی صورت میں تجھے بال و پَر مل بھی جاتے تو تُو کیا کرلیتا؟ پرواز تو وہی کرسکتا ہے جس کا وجود مٹی کی قید سے آزاد ہو۔ تجھے جو کچھ ملا ہے وہ تیری حالت کے مطابق ملا ہے اور وہ عین انصاف ہے۔ یہ تیری نادانی ہے جو تو قدرت کے انصاف کو ظلم اور بے انصافی سمجھ رہا ہے"۔



علامہ اقبالؒ نے درخت اور پرندے کی گفتگو کے پیرائے میں اس نظم میں ہمیں بتایا ہے کہ وجود اپنے عزم اور اپنی ہمت کی بدولت جو چاہے بن سکتا ہے، لیکن ہر حالت کے لیے خاص شرطیں ہیں۔ جب تک وہ شرطیں پوری نہ ہوں، بات نہیں بن سکتی۔ درخت اپنی جگہ یہ سمجھے ہوئے تھا کہ قدرت نے مجھے بال و پَر نہ دے کر مجھ پر ظلم کیا ہے۔ پرندے نے اسے یہ سمجھایا کہ جب تک تو مٹی میں گڑا ہوا ہے اور تیرا وجود مٹی کی کشش سے آزاد نہیں ہے، تب تک تُو بال و پَر مل جانے کے باوجود بھی پرواز نہیں کرسکتا۔

قدرت نے جس کی حالت کے مطابق اسے جو کچھ دیا ہے، وہی انصاف کے عین مطابق ہے۔





شیخِ مکتب سے

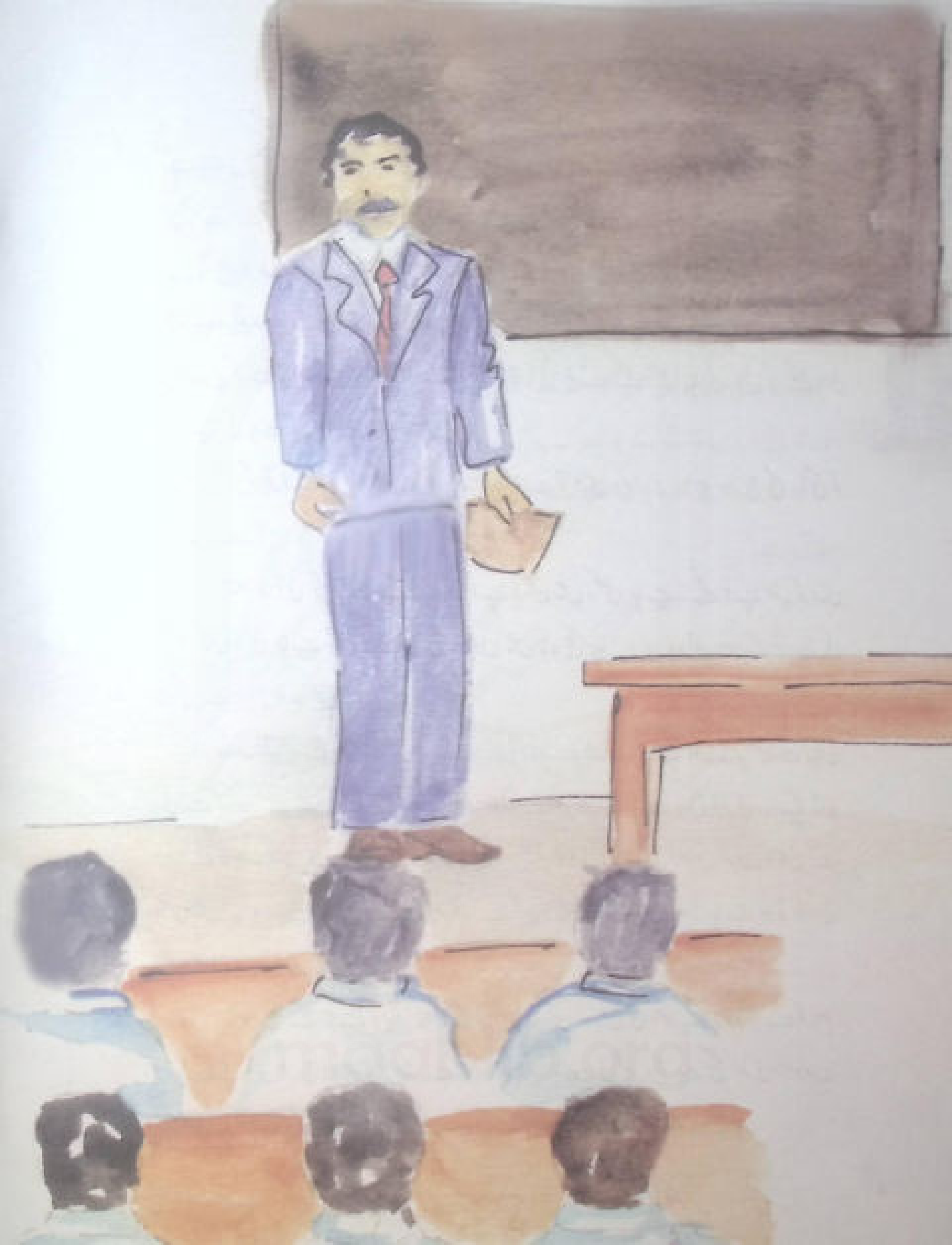
اے مدرسے کے اُستاد! تو معمار ہے جس کا کام انسانی رُوح کی عمارتوں کو صحیح اُصول پر بنانا ہے۔ قدرت کی طرف سے تجھے یہ فریضہ سونپا گیا ہے کہ اپنے طلبہ کی سیرتوں کی تعمیر اعلیٰ پیمانے پر کرے۔ دیکھ ایران کا مشہور شاعر حکیم قاآنی تیرے لیے کیسی پیاری، دل کو لگنے والی اور سچّی بات کہہ گیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

"اگر تو اپنے گھر کا صحن روشن رکھنا چاہتا ہے تو ایسی دیوار نہ بنا جو سورج کی روشنی کو روک دے۔"

حکیم قاآنی کی بات تجھے ہر وقت اپنے ذہن میں رکھنی چاہیے۔ تُجھے اپنے طلبہ کو ایسی تعلیم نہیں دینی چاہیے جس سے اُن کی رُوحوں میں تاریکی پیدا ہو اور وہ فطرت کے سُورج کی روشنی سے محروم ہو جائیں۔

علامہ اقبالؒ نے اس نظم میں مدرسے کے اُستاد سے خطاب کرتے ہوئے یہ حقیقت بیان کی ہے کہ مدرسے میں اُستاد طلبہ کی رُوح کو سنوارنے اور اُن کی سیرت کو صحیح فطری سانچے میں ڈھالنے کا ذمہ دار ہے۔ اُنھوں نے استاد کی توجہ حکیم قاآنی کے ایک شعر کی طرف دلائی ہے جس میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ اگر تم اپنے صحن کو روشن اور نورانی رکھنا چاہتے ہو تو سُورج کے سامنے دیوار مت بناؤ۔

سورج کے سامنے دیوار بناؤ گے تو تمھارا صحن سُورج کی دھوپ اور روشنی سے محروم ہو جائے گا۔ اسی طرح اُستاد کا فریضہ ہے کہ وہ طلبہ کی سیرت کی تعمیر و تربیت صحیح فطری اصولوں کے مطابق کرے تاکہ اُن کی روحیں فطرت کے اُجالے سے محروم نہ ہونے پائیں۔





شاہین

میں نے اپنے آپ کو اس دُنیا سے الگ کرلیا ہے جہاں رزق کا نام آب و دانہ رکھا گیا ہے۔ مجھے بیابان کی تنہائی بہت پسند ہے۔ جب سے یہ دُنیا وجود میں آئی ہے اُس وقت سے میری فطرت درویشوں جیسی چلی آ رہی ہے۔ بیاباں میں نہ بہار کا موسم آتا ہے، نہ پھول پیدا ہوتے ہیں نہ وہاں پھول چننے والے پائے جاتے ہیں نہ وہاں بلبل نظر آتی ہے اور نہ اس کے عشق و محبت سے بھرے ہوئے نغموں کی بیماری کا کوئی وجود ہے۔

باغوں کی رنگ رنگیلی فضاؤں میں بسنے والوں سے الگ تھلگ رہنا میرے لیے لازم ہے۔ اُن کی اداؤں اور اُن کے طور طریقوں میں دلبری کا رنگ ہوتا ہے بھلا مجھے دلبری اور دلبری کی اداؤں سے کیا واسطہ؟ میری دنیا تو عزم و ہمت کی دنیا ہے۔

میں نے باغوں کی رنگینیوں کو چھوڑ کر بیابان کی ویرانیوں کو یوں ہی پسند نہیں کرلیا۔ اس کی ایک خاص وجہ ہے اور وہ یہ ہے کہ بیاباں کی ہواؤں میں رہنے سے جواں مرد کی غازیوں جیسی ضرب میں اور بھی قوت آتی ہے۔ اُن کے مجاہدانہ وار میں اور شدت آجاتی ہے اور یہ مجاہدانہ وار اور زیادہ کاری بن جاتا ہے۔

میں قمری، فاختہ اور کبوتر کا بھوکا نہیں کیونکہ شاہین تو زاہدوں اور درویشوں جیسی زندگی بسر کرتا ہے۔ اگر مجھے محض اپنے شکار کے گوشت اور خون ہی سے غرض ہوتی تو میں ایک ہی ہلّے میں اپنے شکار کی تکّا بوٹی کر دیتا، جب کہ سب جانتے ہیں کہ میرے شکار کا یہ طریقہ ہی نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جس طرح بیابان کی ہوا میری فطرت کی تربیت کا اہم ذریعہ



ہے، اسی طرح میرا شکار کا طریقہ میری فطرت کی تربیت میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ میں پہلے اپنے شکار پر جھپٹتا ہوں، پھر پلٹ آتا ہوں اور پلٹ کر جھپٹتا ہوں۔ یہ جھپٹنا، پلٹنا اور پلٹ کر جھپٹنا محض لہو گرم رکھنے کا ایک بہانہ ہے۔ یہ لہو گرم رہے گا تو اس کی حرارت مجھے ہر وقت جدوجہد میں لگائے رکھے گی اور یہی سخت کوشی شاہین کے لیے حقیقی زندگی ہے۔

پُورب اور پچھم چکوروں کی دُنیا کی علامتیں ہیں جنھیں عزم وہمت اور بلند پروازی سے کوئی واسطہ نہیں۔ میری دنیا میں تو نہ کوئی مشرق ہے اور نہ کوئی مغرب، نہ شمال، نہ جنوب۔ میں تو نیلے آسمان کی فضاؤں میں پرواز کرتا ہوں جن کا کوئی کنارہ نہیں۔

میرے یہ اوصاف مجھے پرندوں کی دُنیا سے ممتاز کرتے ہیں۔ میں پرندوں کی دُنیا کا درویش ہوں۔ جس طرح ایک درویش دنیا پر لات مار کر گھر بار کے بکھیڑوں سے بے نیاز اور آزاد ہو جاتا ہے، اسی طرح شاہین بھی گھر بار کے بکھیڑوں سے بے نیاز اور آزاد رہتا ہے۔ پرندوں کی دنیا کا یہ درویش اپنے لیے گھونسلا نہیں بناتا۔ ایک سچے درویش کی شان یہی ہے۔

علامہ اقبالؒ نے اس نظم میں شاہین کی خصوصیات خود اُس کی زبان سے بیان فرمائی ہیں۔ اُنھوں نے شاہین کی جو خصوصیات بیان کی ہیں، یہی حقیقت میں فقر و درویشی کی خصوصیات ہیں۔

اقبال نے اپنے کلام میں جن علامتوں سے کام لیا ہے ان میں شاہین سرفہرست ہے۔ اس سلسلہ میں وہ خط بہت اہم ہے جو انھوں نے ظفر احمد صدیقی کے نام لکھا تھا۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:

''شاہین کی تشبیہ محض شاعرانہ تشبیہ نہیں ہے۔ اس جانور میں اسلامی فقر کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں (۱) خوددار اور غیرت مند ہے کہ اور کسی کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں

کھاتا (۲) بے تعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا (۳) بلند پرواز ہے (۴) تیز نگاہ ہے۔

گویا علامہ اقبالؒ کو شاہین اس لیے پسند ہے کہ اس کے اندر وہ تمام صفات موجود ہیں جو اُن کے نزدیک ایک مردِ مومن یا مردِ درویش میں ہونی چاہییں۔ علامہ اقبالؒ اپنی قوم کے نوجوانوں میں یہی صفات دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس لیے اُنھیں شاہین بچے کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ شاہین کو اس طرح علامت بنا کر اس سے پہلے اُردو کے کسی شاعر نے پیش نہیں کیا تھا۔ یہ صرف علامہ اقبالؒ ہیں جنھیں اس پرندے میں قوت، تیزی، نظر کی وسعت، دور بینی، بلند پروازی، خودداری اور درویشی و بے نیازی جیسی وہ تمام صفات نظر آئیں اور انھوں نے اسے قوم کے نوجوانوں کے لیے ایک مثال اور علامت بنا دیا۔ چنانچہ اس نظم میں انھوں نے شاہین کی ان تمام صفات کو شاہین ہی کی زبانی بیان کیا ہے۔

ہارون کی آخری نصیحت

جب عباسی خاندان کے نامور خلیفہ ہارون الرشید کا آخری وقت آیا تو اُس نے اپنے بیٹے سے کہا:

"اے میرے بیٹے! جان لے کہ موت برحق ہے۔ اس کے پنجے سے کوئی بچ نہیں سکتا۔ میری طرح ایک دن تجھے بھی آخر کار اسی راستے سے گزرنا ہے۔ مومن ہو یا کافر، جو اس دُنیا میں آیا ہے، ایک روز اُسے موت کا ذائقہ چکھنا ہے لیکن مومن کی موت کی کیفیت اور ہے، کافر کی موت کا رنگ اور ہوتا ہے۔ جو شخص کافر ہے۔ اس کی نظروں سے موت کا فرشتہ چھپا رہتا ہے اس لیے کہ موت اُسے یاد نہیں رہتی۔ وہ اس دنیا میں ایسے زندگی گزارتا ہے جیسے اُس کے لیے اس دُنیا کی زندگی ہی سب کچھ ہے۔ لیکن اے میرے بیٹے! مومن کی موت کی شان ہی کچھ اور ہے۔ موت کا فرشتہ ایک لمحے کے لیے مسلمان کی نظروں سے چھپا نہیں رہتا۔ کیونکہ مسلمان موت کو ہر وقت یاد رکھتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ یہ خیال کرتے ہوئے گزارتا ہے کہ اُسے ایک دن مر کر خُدا کے سامنے پیش ہونا ہے اور اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہے۔ اس لیے وہ ہر وقت اور ہر حال میں موت کو یاد رکھتا ہے۔"

علامہ اقبالؒ نے اس نظم میں یہ حقیقت بیان کی ہے کہ اس دنیا میں اگرچہ ہر انسان کو ایک نہ ایک دن موت کا ذائقہ چکھنا ہوتا ہے لیکن کافر چونکہ خدا کا منکر ہوتا ہے، اس لیے موت اُسے یاد نہیں رہتی۔ وہ موت کے بعد کی زندگی کا بھی قائل نہیں ہوتا اور اسی دُنیا کی زندگی کو سب کچھ سمجھتا ہے۔ اس کے برعکس مسلمان کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ دُنیا آخرت کی کھیتی


كل نفس ذائقة الموت

ہے۔ جو شخص یہاں نیک کام کرے گا وہ موت کے بعد آخرت کی زندگی میں ان نیک کاموں کا اجر پائے گا۔ جو یہاں بُرے کام کرے گا، اُسے موت کے بعد آخرت کی زندگی میں ان بُرے کاموں کی سزا ملے گی۔ اس لیے مسلمان کو ہر قدم پر موت یاد رہتی ہے۔ صاحبِ ایمان کی شان بھی یہی ہے کہ موت کو ایک لمحے کے لیے بھی نہ بھولے۔ یُوں بھی دُنیا میں موت کی یاد تازہ رہنے سے انسان کو نیک کام کرنے کی تحریک ہوتی ہے۔

علامہ اقبال نے اس اہم حقیقت کو خلیفہ ہارون الرشید کی اپنے بیٹے کو آخری نصیحت کے پیرائے میں بیان کیا ہے کہ موت کا فرشتہ کافر کی نظروں سے تو پوشیدہ رہتا ہے لیکن وہ مسلمان کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ کافر کو موت کا کبھی دھیان ہی نہیں آتا جبکہ مسلمان ہر وقت موت کو یاد رکھتا ہے۔

شیر اور خچر

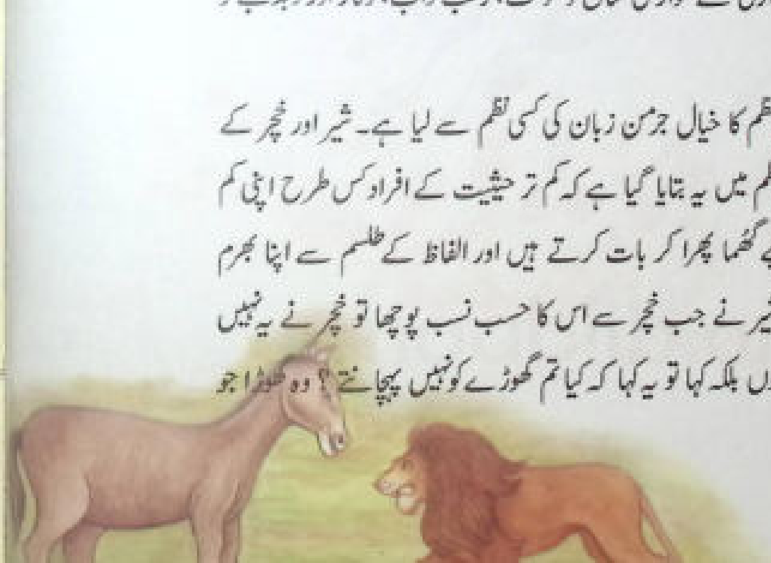
ایک شیر نے خچر کو دیکھا تو حیران ہو کر کہنے لگا۔

"جنگل اور بیابان میں چھوٹے بڑے جتنے جانور رہتے ہیں، میں نے وہ سب دیکھے ہیں۔ تیری وضع قطع اُن سب سے الگ اور نرالی ہے۔ ذرا یہ تو بتا کہ تیرے باپ دادا کون تھے اور تو کس قبیلے سے ہے؟"

شیر کا سوال سُن کر خچر نے سوچا کہ اگر میں باپ کا ذکر کروں تو کہنا پڑے گا کہ گدھے کی اولاد ہوں اور یہ بات میری ہتک اور بے عزتی کا باعث بنے گی۔ اس لیے اس نے باپ دادا کی بجائے ماں کا سلسلہ بیان کرتے ہوئے کہا:

"حضور! شاید آپ میرے ماموں کو نہیں پہچانتے! کیا آپ نے اُس گھوڑے کو نہیں دیکھا جو ہوا کی طرح چلتا ہے؟ جس کی شاہی اصطبل میں موجودگی سے اصطبل کی عزت اور آبرو بڑھتی ہے اور جس کی سواری سے سوار کی شان و شوکت، رعب داب، وقار اور دبدبے کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔"

علامہ اقبالؒ نے اس نظم کا خیال جرمن زبان کی کسی نظم سے لیا ہے۔ شیر اور خچر کے مکالمے کے پیرائے میں اس نظم میں یہ بتایا گیا ہے کہ کم تر حیثیت کے افراد کس طرح اپنی کم حیثیتی پر پردہ ڈالنے کے لیے گھما پھرا کر بات کرتے ہیں اور الفاظ کے طلسم سے اپنا بھرم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شیر نے جب خچر سے اس کا حسب نسب پوچھا تو خچر نے یہ نہیں بتایا کہ میں گدھے کی اولاد ہوں بلکہ کہا تو یہ کہا کہ کیا تم گھوڑے کو نہیں پہچانتے؟ وہ گھوڑا جو





ہوا کی طرح باتیں کرتا ہے اور جس کے دم قدم سے شاہی اصطبل کی رونق اور عزت بنی ہوئی ہے۔ وہی گھوڑا تو میرا ماموں ہے۔

''حسن بیان'' کے یہ کرشمے دنیا میں اکثر دیکھنے میں آتے ہیں۔ حجام کا بیٹا یہ کبھی نہیں کہتا کہ میرا باپ حجام ہے بلکہ وہ کہتا ہے کہ میرا باپ ایسا ہے کہ اس کے سامنے بادشاہ بھی سر جھکاتا ہے۔ باورچی کا بیٹا یہ نہیں کہے گا کہ میرا باپ کھانا پکانے کا کام کرتا ہے بلکہ یہ کہے گا میرا باپ ایسے مرتبے والا ہے کہ جب تک وہ نہ آئے دعوت میں بیٹھے ہوئے لوگ کھانا نہیں کھا سکتے اور اس کی آمد کے انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں۔



چیونٹی اور عقاب

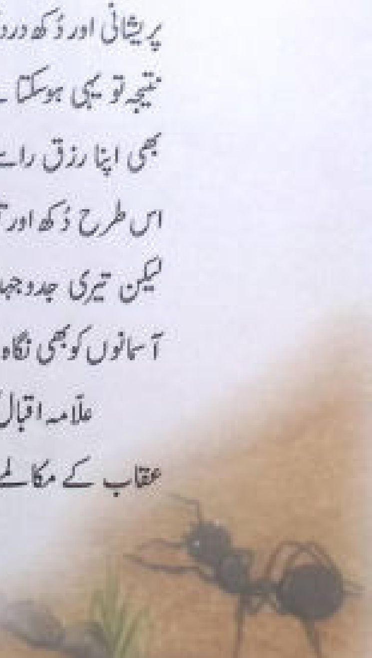
ایک چیونٹی نے عقاب سے کہا۔

"اے عقاب! مجھے ایک بات تو بتا۔ لوگ مجھے پاؤں کے نیچے روندتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ میں ذلیل و خوار ہوں۔ دن رات کی محنت اور مشقت کے باوجود پریشان اور دُکھی ہوں۔ آخر اس کا سبب کیا ہے؟ رزق کے لیے جدوجہد تو میں بھی کرتی ہوں اور تُو بھی کرتا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ میں لوگوں کے قدموں تلے پامال ہو کر دن رات دُکھ سہتی ہوں اور تیرا مقام و مرتبہ ستاروں سے بھی بلند ہے؟"

چیونٹی کی بات سن کر عقاب نے جواب دیا۔

"اے چیونٹی! اپنی پریشانی اور دُکھ کا باعث تو خود ہے۔ تیری پامالی، ذلت و خواری، پریشانی اور دُکھ درد کا باعث یہ ہے کہ تُو اپنا رزق راستے کی خاک سے تلاش کرتی ہے۔ اس کا نتیجہ تو یہی ہو سکتا ہے کہ ہر راہ چلنے والا تجھے روندتا ہوا گزر جائے اور تُو دُکھ اٹھاتی رہے۔ جو بھی اپنا رزق راستے کی خاک میں تلاش کرے گا وہ راستہ چلنے والوں کے پیروں تلے آ کر اس طرح دُکھ اور تکلیف اُٹھائے گا۔ تیری طرح رزق کے لیے جدوجہد تو میں بھی کرتا ہوں لیکن تیری جدوجہد راستے کی خاک تک محدود ہے جبکہ میں رزق کی تلاش کرتے ہوئے آسمانوں کو بھی نگاہ میں نہیں لاتا۔

علامہ اقبالؒ نے اس نظم میں چیونٹی اور عقاب کی زندگی کا موازنہ کیا ہے۔ چیونٹی اور عقاب کے مکالمے کے پیرائے میں انھوں نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ رزق کی تلاش کے لیے





جدوجہد تو سب ہی جان داروں کو کرنی پڑتی ہے لیکن جدوجہد کا یہ میدان ہر ایک کے عزم و حوصلے اور ہمت و طاقت کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے۔ اونچا مقام و مرتبہ ان ہی کا حق ٹھہرتا ہے جن کی جدوجہد کا میدان دوسروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ وسیع ہوتا ہے۔ عزت کے حق دار وہ ٹھہرتے ہیں جو رزق کی تلاش میں زمین سے چپٹے رہنے کی بجائے آسمانوں کی بے کراں فضاؤں کو کھنگال ڈالتے ہیں۔ چیونٹی اس لیے ذلیل و خوار ہے کہ وہ راستے کی خاک سے اپنا رزق تلاش کرتی ہے۔ اس کے مقابلے میں عقاب اس لیے ارجمند ہے کہ وہ تلاشِ رزق میں آسمانوں کی بے کراں وسعتوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔



حکایاتِ ضربِ کلیم

طالب علم

اے نوجوان طالب علم ! تیرے لیے میری دعا ہے کہ خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کردے۔ تو اگرچہ سمندر ہے لیکن تیری لہروں میں مجھے کوئی تڑپ، کوئی بے تابی، کوئی بے قراری نظر نہیں آتی۔ ایسا سمندر ہونے سے کیا حاصل جس میں موجیں ایک دوسرے سے ٹکرا نہ رہی ہوں؟ یہ کیفیت تو اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے کہ سمندر میں طوفان آجائے۔ تیری حالت تو یہ ہے کہ تیرے دل میں نہ کسی بلند مقصدیت کی آرزو ہے نہ عشقِ حق کا جذبہ نظر آتا ہے۔ میری دعا یہی ہے کہ خدا یہ چیزیں تجھے عطا کردے۔

تو ساری عمر یوں ہی کتابیں پڑھتا اور رٹتا رہے گا لیکن کتابیں پڑھنے اور رٹنے سے تیری زندگی کا مقصد کبھی تجھ پر واضح نہ ہو سکے گا۔ تیرا المیہ یہ ہے کہ تو ''کتاب خواں'' تو بن گیا ہے لیکن ''صاحبِ کتاب'' نہیں بن سکا اور جب تک تو صاحبِ کتاب نہ بن جائے، نہ صحیح معنوں میں طالب علم بن سکتا ہے اور نہ تجھے اپنی زندگی کے بلند مقاصد سے آگاہی ہو سکتی ہے۔

علامہ اقبالؒ نے اس نظم میں مسلمان طالب علم سے خطاب کرتے ہوئے اسے ایک ایسا نکتہ سمجھایا ہے جس پر عمل کرنے سے قوم کی زندگی میں انقلاب رونما ہو سکتا ہے۔ وہ طالب علم سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تیرے دل میں ترقی اور سربلندی حاصل کرنے کی کوئی امنگ پیدا نہیں ہوتی اس لیے میری دعا ہے کہ خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کردے یعنی تیرے دل میں وہ تڑپ پیدا کردے کہ تو دنیا میں اپنے آپ کو اور دینِ اسلام کو سربلند کرنے کے جذبے سے سرشار ہو جائے اور پھر اس مقصد کے لیے ہمہ تن جدو جہد بن جائے۔ علامہ اقبالؒ کے نزدیک



مسلمان کی ترقی اور سربلندی اسلام کی ترقی اور سربلندی پر موقوف ہے۔ کیوں کہ مسلمان کے عدم سے وجود میں آنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ دنیا میں اسلام کو سربلند کرے اور جس مسلمان کے دل میں یہ تڑپ نہ ہو وہ اور تو سب کچھ ہو سکتا ہے، سچا مسلمان نہیں ہو سکتا۔

پھر علامہ اقبالؒ طالب علم سے کہتے ہیں کہ تو کتابیں پڑھنے اور رٹنے میں لگا رہتا ہے اور اپنی ساری زندگی اسی کام میں کھپا رہا ہے حالاں کہ اس کام سے تجھے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا کیوں کہ ان کتابوں سے جو غیروں کے علوم پر مشتمل ہیں۔ تیری زندگی کا حقیقی مقصد کبھی تجھ پر واضح نہیں ہو سکے گا۔ تو کتاب خواں تو بن گیا ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں بنا۔ آدمی صاحبِ کتاب اس وقت ہو سکتا ہے جب اس کے دل و دماغ پر کتابوں کے مطالب اس طرح روشن ہو جائیں جیسے وہ کتابیں اس کے اپنے ذہن کی تخلیق ہیں۔ یہ بات تو ان کتابوں کی ہے جنھیں آدمی پڑھتا اور طوطے کی طرح رٹتا رہتا ہے، اللہ کے کلام کی بات ہی دوسری ہے۔ اللہ کے کلام کے ضمن میں آدمی صاحبِ کتاب اس وقت کہلا سکتا ہے جب اس نے اپنے دل کو ایسا پاک صاف کر لیا ہو کہ جب وہ اللہ کا پاک اور مقدس کلام پڑھے تو اسے یہ محسوس ہو کہ یہ کلام میرے ہی دل پر نازل ہوا ہے۔

اے نوجوان طالب علم! تجھے کتاب خواں بننے کی بجائے اسی طرح کا صاحبِ کتاب بننے کی سعی کرنی چاہیے۔ تو نے غیروں کے علوم تو بہت پڑھے، لیکن اللہ کے کلام سے فیض حاصل نہیں کیا۔ اگر تو حقیقی علم کا طلب گار ہے تو اپنے دل کو اللہ کی محبت کے نور سے منور کر۔ عشق کے بغیر محض علم مسلمان کو صحیح معنوں میں مسلمان نہیں بنا سکتا۔

امتحان

پہاڑ کی ندی نے ایک دن سنگ ریزے سے کہا:

"مجھے تیرے حال پر افسوس ہوتا ہے کہ تو سر جھکائے رہنے اور عاجزی کی حالت میں ایک ہی جگہ پڑے رہنے کو اپنی زندگی کی معراج سمجھے ہوئے ہے۔ تیری حالت یہ ہے کہ ہر کوئی تجھے اپنے پیروں تلے روندتے ہوئے گزر جاتا ہے اور تو چپ چاپ زمین پر پڑا ہوا دکھ درد سہتا رہتا ہے۔ تیری زندگی کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں کہ زمین پر پڑا رہے اور لوگوں کے قدموں تلے روندے جانے کے صدمے اٹھاتے اٹھاتے فنا ہو جائے۔

"تو ذرا میری شان بھی دیکھ! کہنے کو میں ایک چھوٹی سی ندی ہوں لیکن دیکھ دریا بھی میرے آگے ہاتھ پھیلاتا ہے۔ میری قوت کا یہ عالم ہے کہ میں پہاڑوں سے ٹکراتی ہوں۔ اپنی ضربوں سے چٹانوں کو توڑ دیتی ہوں اور خود اپنا راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھتی چلی جاتی ہوں۔ دریاؤں اور سمندروں کا وجود میرے ہی دم قدم سے قائم ہے۔

"مجھے تیری حالت پر اس لیے افسوس ہوتا ہے کہ تو کسی دیوار سے نہیں ٹکراتا خاموش سر جھکائے زمین پر پڑا رہتا ہے، اس لیے دنیا تیری ذاتی خوبیوں سے نہ واقف ہے اور نہ واقف ہو سکتی ہے۔ تو نے دنیا میں کبھی بہادروں کی طرح آفتوں اور مصیبتوں کا مقابلہ کر کے اپنے جوہر نہ دکھائے۔ ایسے میں دنیا کو کیا خبر کہ تو ایک سخت پتھر ہے یا شیشے کا ایک نرم و نازک ٹکڑا ہے؟

علامہ اقبالؒ نے اس نظم میں ہمیں بتایا ہے کہ اگر کوئی شخص دنیا کو اپنے ذاتی



اوصاف و کمالات کا قائل کرنا چاہتا ہے یا دنیا والوں کے سامنے اپنی خودی کی قوتوں کا اظہار کرنا چاہتا ہے تو اس کو مشکلات و مصائب اور آفات و صدمات کی دیوار سے ٹکرانا پڑے گا اور اس کے لیے مناسب تیاری شرطِ اولین ہے۔ دنیا کا قاعدہ یہی ہے کہ وہ قوت کے سامنے جھکتی ہے اور اسی کا لوہا مانتی ہے جو اپنا لوہا منوانے کی ہمت، اہلیت اور قوت رکھتا ہو ۔

مری نظر میں یہی ہے جمال و زیبائی
کہ سربسجدہ ہیں قوت کے سامنے افلاک

چنانچہ وہ پہاڑ کی ندی کی زبان سے سنگ ریزے کو اس حقیقت کا احساس دلاتے ہیں کہ اگرچہ تو اصل کے لحاظ سے پتھر کی طرح سخت ہے لیکن دنیا کو تیری اس خوبی کا ادراک کیسے ہوسکتا ہے جب کہ تو ہر وقت سر جھکائے چپ چاپ زمین پر پڑا رہتا ہے اور لوگ تجھے اپنے پیروں تلے روندتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ کسی کو کیا معلوم کہ تو پتھر کی طرح سخت ہے یا شیشے کی طرح نرم و نازک۔ کیا تو نے کبھی کسی دیوار سے ٹکرا کر دوسروں پر اپنی حقیقت اور اصلیت ظاہر کرنے کی کوشش بھی کی ہے؟

اس طرح علامہ اقبالؒ ہمیں بتاتے ہیں کہ دنیا تو اسی کو باکمال سمجھتی ہے جو بے پناہ قوت اور طاقت کے بل پر مشکلات و مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے ان پر غالب آجائے اور لوگوں سے اپنی عظمت و سربلندی اور طاقت و قوت کا لوہا منوالے۔

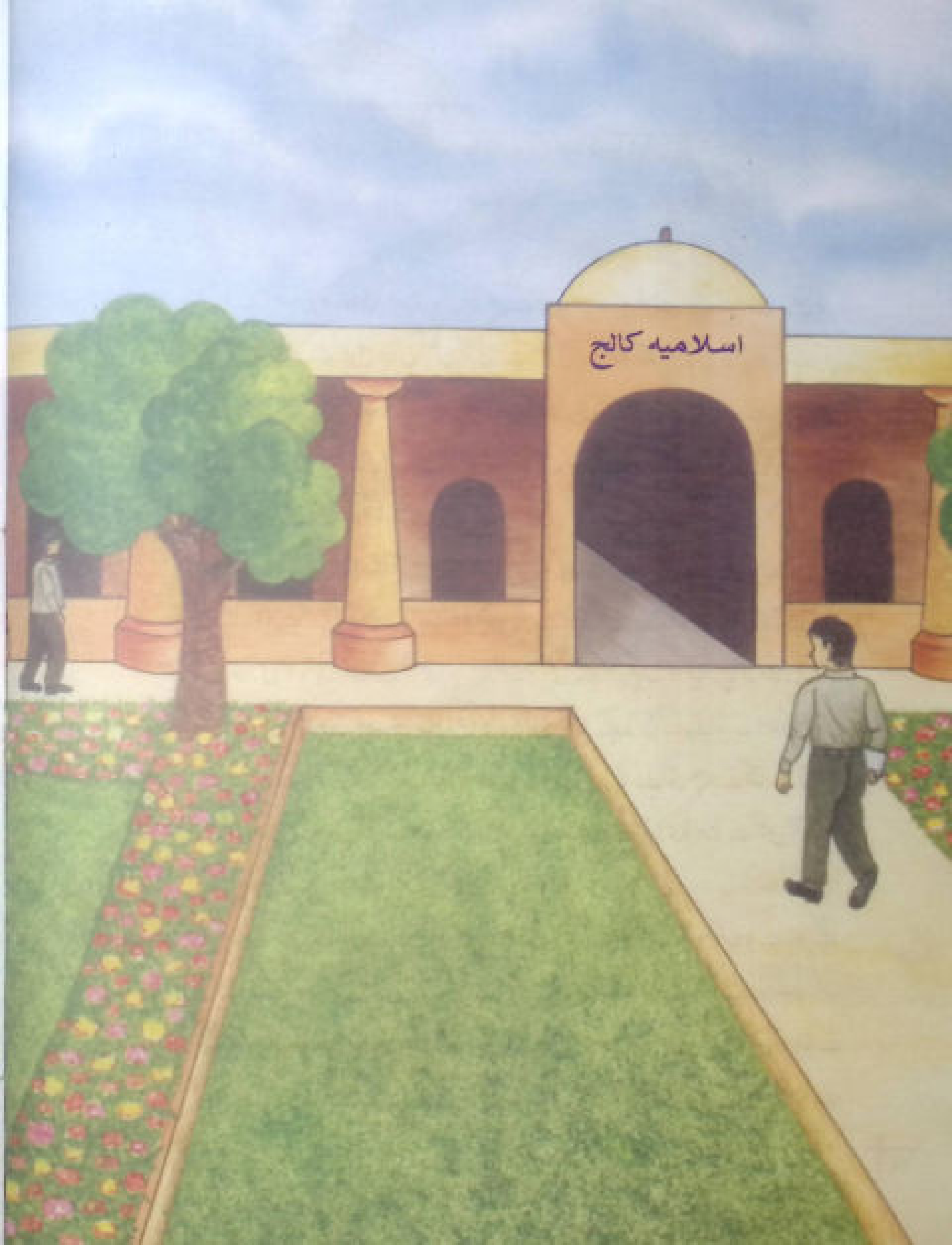


مدرسہ

اے مسلمان نوجوان! موجودہ زمانہ تیرے لیے موت کا فرشتہ ہے جس نے تجھے فکرِ معاش میں مبتلا کر کے تیری روح قبض کر لی ہے۔ فرنگی نے جو نظام یہاں قائم اور مسلط کیا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ تو دن رات روٹی کمانے ہی کے چکر میں پھنسا رہے۔ اس چکر نے تیری روح کو فنا کر ڈالا۔ اب تو فکرِ معاش ہی میں اس قدر سرگرداں ہے کہ کوئی بلند جذبہ تیرے اندر پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔

اے مسلمان نوجوان! مفلسی اور احتیاج نے تجھے بزدل اور ڈرپوک بنا دیا ہے۔ تو ہر وقت ڈرتا رہتا ہے کہ اگر میں نے خدا کا نام لیا یا اپنے طرزِ عمل سے مسلمان ہونے کا ثبوت دیا تو میری روزی کا وسیلہ مجھ سے چھن جائے گا۔ تو اس قدر ڈرپوک ہو گیا ہے کہ مقابلے اور مسابقت کی کش مکش کے تصور ہی سے تیرا دل کانپ اٹھتا ہے۔ سچ ہے کہ جب زندگی ذوقِ خراش کھو دیتی ہے اور انسان تکالیف اور مصائب برداشت کرنے سے جی چرانے لگتا ہے تو اس کی زندگی، زندگی نہیں رہتی، موت بن جاتی ہے۔ ایسا انسان بظاہر تو زندہ ہوتا ہے لیکن حقیقت میں وہ مر چکا ہوتا ہے۔

اے مسلمان نوجوان! مدرسے کی تعلیم نے تجھے اس "جنون" سے محروم کر دیا ہے جو تجھے ورثے میں ملا تھا۔ وہ ایسا جنون تھا جو تیرے اسلاف کو ہمہ وقت اسلام کے لیے سربکف رکھتا تھا۔ وہ اسلام کی خاطر ہر وقت سر کٹانے کو تیار رہتے تھے۔ وہ ایسا جنون تھا جو عقل کو بہانے تراشنے سے باز رکھتا تھا، مگر درس گاہوں میں نصاب تعلیم ایسا ہے جس نے تجھے اسلام سے

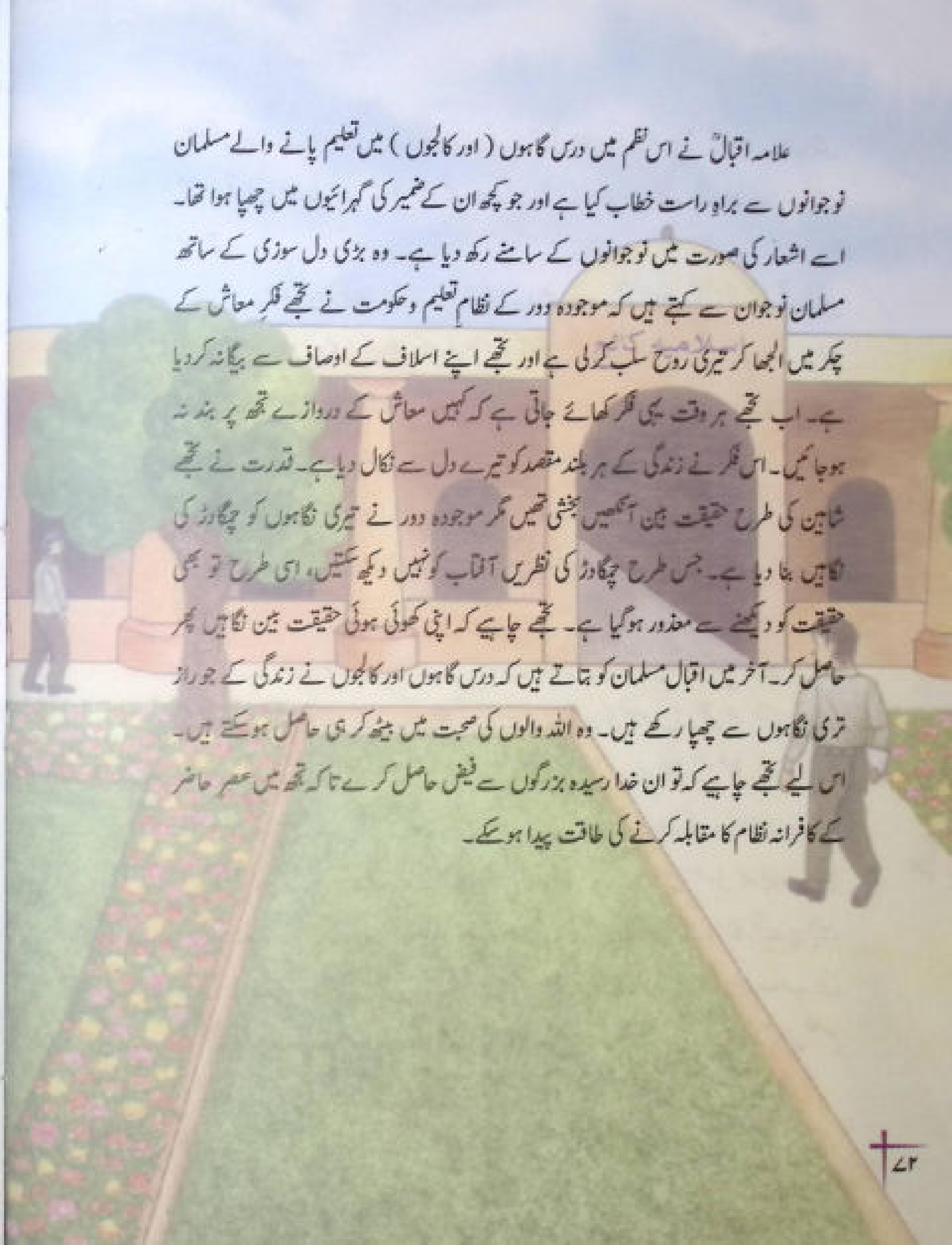

اسلامیہ کالج



بیگانہ کر رکھا ہے۔ اسی لیے مسلمان نوجوان اپنے آبائی جنون سے محروم ہو گئے ہیں۔ ان میں حق پر قربان ہونے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کے بلند و پاکیزہ جذبات پیدا ہی نہیں ہوتے۔

اے مسلمان نوجوان! قدرت نے کمال فیاضی سے تجھے شاہین کی آنکھ بخشی تھی لیکن غلامی نے اس میں چمگادڑ کی نگاہ رکھ دی تا کہ تو آفتاب کی روشنی کو دیکھ ہی نہ سکے۔ اب یہ تیرا فرض ہے کہ تو اپنے اس عظیم نقصان کا احساس کرتے ہوئے عصرِ حاضر کے اس باطل نظام سے مقابلہ کی قوت اپنے اندر پیدا کرے اور اپنی کھوئی ہوئی حق بین نظریں پھر حاصل کر لے۔ جب تک تو اپنی حق بین نظریں دوبارہ حاصل نہیں کرے گا۔ تیری زندگی بالکل بے کار ہے اور تیرا عدم اور وجود دونوں برابر ہیں۔ اس لیے اپنے حقیقی دشمن کو پہچان اور اس سے مقابلے کی تیاری کر۔

اے مسلمان نوجوان! مدرسے کی تعلیم نے جو راز تیری نگاہوں سے چھپا رکھے ہیں، وہ پہاڑ اور جنگل کی تنہائیوں میں صاف نظر آتے ہیں۔ مدرسے کی تعلیم نے تجھے جن حقیقتوں سے بیگانہ بنا رکھا ہے۔ وہ پہاڑوں اور جنگلوں میں رہنے والے مردانِ حق کے فیضِ صحبت سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ یہ مردانِ حق وہ ہیں جو اگرچہ عالی شان محلات اور بلند و بالا عمارات کے عیش و عشرت سے لبریز ماحول سے بہت دور جنگلوں اور بیابانوں میں معمولی جھونپڑوں میں بسیرا کرتے ہیں لیکن ان بوریا نشینوں کا رعب و جلال عالی شان محلات کے زرنگار تخت پر بیٹھنے والوں کی نیندیں حرام کیے رکھتا ہے۔ پس اے مسلمان نوجوان! تو اللہ والوں اور صاحبِ دل بزرگوں کی صحبت اختیار کر۔ تا کہ تجھ میں کفر کا مقابلہ کرنے کی قوت پیدا ہو سکے اور تو اس طلسم کو پاش پاش کر سکے جس میں عصرِ حاضر نے تجھے فکرِ معاش کے نام پر اسیر کر رکھا ہے۔



علامہ اقبالؒ نے اس نظم میں درس گاہوں (اور کالجوں) میں تعلیم پانے والے مسلمان نوجوانوں سے براہِ راست خطاب کیا ہے اور جو کچھ ان کے ضمیر کی گہرائیوں میں چھپا ہوا تھا۔ اسے اشعار کی صورت میں نوجوانوں کے سامنے رکھ دیا ہے۔ وہ بڑی دل سوزی کے ساتھ مسلمان نوجوان سے کہتے ہیں کہ موجودہ دور کے نظامِ تعلیم و حکومت نے تجھے فکرِ معاش کے چکر میں الجھا کر تیری روح سلب کر لی ہے اور تجھے اپنے اسلاف کے اوصاف سے بیگانہ کر دیا ہے۔ اب تجھے ہر وقت یہی فکر کھائے جاتی ہے کہ کہیں معاش کے دروازے تجھ پر بند نہ ہو جائیں۔ اس فکر نے زندگی کے ہر بلند مقصد کو تیرے دل سے نکال دیا ہے۔ قدرت نے تجھے شاہین کی طرح حقیقت بین آنکھیں بخشی تھیں مگر موجودہ دور نے تیری نگاہوں کو چمگادڑ کی نگاہیں بنا دیا ہے۔ جس طرح چمگادڑ کی نظریں آفتاب کو نہیں دیکھ سکتیں، اسی طرح تو بھی حقیقت کو دیکھنے سے معذور ہو گیا ہے۔ تجھے چاہیے کہ اپنی کھوئی ہوئی حقیقت بین نگاہیں پھر حاصل کر۔ آخر میں اقبال مسلمان کو بتاتے ہیں کہ درس گاہوں اور کالجوں نے زندگی کے جو راز تری نگاہوں سے چھپا رکھے ہیں۔ وہ اللہ والوں کی صحبت میں بیٹھ کر ہی حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس لیے تجھے چاہیے کہ تو ان خدا رسیدہ بزرگوں سے فیض حاصل کرے تا کہ تجھ میں عصرِ حاضر کے کافرانہ نظام کا مقابلہ کرنے کی طاقت پیدا ہو سکے۔

حکایاتِ ارمغانِ حجاز



تُرک ملاح کا نغمہ

چہ خوش زد تُرک ملاحے سرودے
رُخ او احمرے، چشمش کبودے
بدر یا گر گرہ اُفتد بہ کارم
بجز طوفاں نے خواہم کشودے

میں نے ایک تُرک ملاح کو دیکھا۔ اس کا چہرہ خون کی سرخی سے لال بھبوکا معلوم ہو رہا تھا اور اس کی نیلی آنکھیں گہرے نیلے سمندروں کی طرح نظر آتی تھیں۔ سرخ سرخ چہرے اور نیلی نیلی آنکھوں والا یہ تُرک ملاح اپنی جوش اور مستی بھری آواز میں ایک نہایت ہی پیارا نغمہ گا رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا:

''سمندر میں جہاز رانی کرتے وقت اگر میرے سامنے کوئی دشواری آجائے یا میرے کام میں کوئی رکاوٹ پیدا ہو جائے تو میں بالکل نہیں گھبراتا اور نہ کسی سے مدد کا طلب گار ہوتا ہوں۔ میں تو ایسی حالت میں طوفان کو آواز دیتا ہوں اور کہتا ہوں کہ آ اور میری مشکل کو آسان کر۔ میری تو یہ دعا ہوتی ہے کہ سمندر میں طوفان اٹھ کھڑا ہوتا کہ میں اسی طوفان کے مقابلے میں اپنی تمام مخفی صلاحیتوں کو بروئے کار لاسکوں۔ چنانچہ میری زندگی میں جس قدر زیادہ مشکلات آتی ہیں اتنا ہی میرا عزم وحوصلہ اور بلند ہو جاتا ہے۔''

علامہ اقبالؒ نے اس رُباعی میں تُرک ملاح کی زبانی دنیا میں کامیابی و کامرانی اور



اوج و سربلندی کا راز بیان کیا ہے کہ دنیا میں کامیابی و کامرانی اس شخص کا مقدر بنتی ہے جو نہ صرف یہ کہ مشکلات و مصائب کو دیکھ کر حوصلہ نہیں ہارتا بلکہ آگے بڑھ کر ان کا ایسے جوش اور ولولے سے مقابلہ کرتا ہے جیسے وہ مشکلات و مصائب اس کا راستہ روکنے نہیں بلکہ اس کے جوش اور ولولے کو بڑھانے اور اس کے حوصلوں کو پروان چڑھانے ہی کے لیے وجود میں آئے ہوں۔ اسی طرح دنیا میں وہی قوم اوج و سربلندی کے مقام پر فائز ہوتی ہے جو نہ صرف مشکلات و مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرنا جانتی ہو بلکہ اس میں اور اس کے افراد میں مشکلات و مصائب کو دعوت دینے کی ہمت اور جرأت موجود ہو۔ اگر کسی قوم کے افراد میں یہ جرأت و ہمت مفقود ہو تو اپنی تمام گوناگوں ظاہری و باطنی صلاحیتوں کے باوجود وہ قوم دنیا میں سربلند نہیں ہوسکتی۔

شتر اور بچۂ شتر

شتر را بچۂ او گفت در دشت
نمی بینم خدائے چار سو را
پدر گفت اے پسر چوں پا بہ لغزد
شتر ہم خویش را بیند، ہم او را

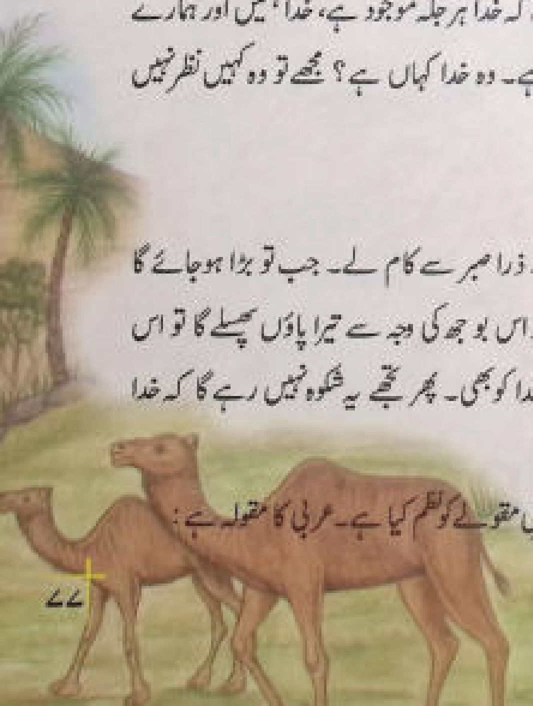
کسی جنگل میں ایک اونٹ اور اس کا بچہ چرتے پھر رہے تھے۔ اونٹ کے بچے نے اونٹ سے کہا:

"آپ اکثر خدا کا ذکر کرتے رہتے ہیں کہ خدا ہر جگہ موجود ہے، خدا ہمیں اور ہمارے سب کاموں کو دیکھتا ہے، خدا ہمارا پالنے والا ہے۔ وہ خدا کہاں ہے؟ مجھے تو وہ کہیں نظر نہیں آتا۔"

اونٹ نے جواب دیا۔

"اے میرے بیٹے! تو ابھی چھوٹا ہے۔ ذرا صبر سے کام لے۔ جب تو بڑا ہو جائے گا اور بڑا ہو کر میری طرح بوجھ اٹھانے لگے گا اور اس بوجھ کی وجہ سے تیرا پاؤں پھسلے گا تو اس وقت تو اپنے آپ کو بھی دیکھ لے گا اور اپنے خدا کو بھی۔ پھر تجھے یہ شکوہ نہیں رہے گا کہ خدا کہیں نظر نہیں آتا۔"

علامہ اقبالؒ نے اس رُباعی میں ایک عربی مقولے کو نظم کیا ہے۔ عربی کا مقولہ ہے:





اَلْجَمَلُ لَا یَعْرِفُ الْحَقَّ اِلَّا عِنْدَ الزَّلَقِ

(اونٹ خدا کو نہیں پہچانتا جب تک اس کا پاؤں نہ پھسلے)

جب انسان زندگی کے مسائل اور اس کی مشکلات سے دو چار ہوتا ہے اور انتہائی کوشش، جدوجہد اور دوڑ دھوپ کے باوجود کبھی کبھی اپنے مقصد کے حصول میں ناکام ہوجاتا ہے تو اسی وقت اسے اندرونی طور پر یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کائنات میں ضرور مجھ سے بالاتر کوئی قوت موجود ہے جس کا حکم اس ساری کائنات پر چلتا ہے۔ بقول اکبر الٰہ آبادی ؎

تدبیر سدا راست جو آتی نہیں اکبرؔ

معلوم ہوا یہ کہ خدا بھی ہے کوئی چیز!

انسان اپنی عقل و خرد کو اپنے وسائل کو، اپنی جدوجہد کو، غرض کہ اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھتا ہے اور اپنے آگے کسی کو خاطر میں نہیں لاتا لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ اونٹ جب تک پہاڑ تلے نہ آئے کسی کو اپنے سے اونچا نہیں سمجھتا۔ اس طرح انسان کی زندگی میں قدم قدم پر ایسے مقام آتے ہیں جب اس کی ساری عقل و خرد اور ساری دانش مندی دھری رہ جاتی ہے۔ جب تمام ظاہری مادی وسائل کے باوجود اس کی جدوجہد اور دوڑ دھوپ ناکامی و نامرادی سے دوچار ہوتی ہے اور جب کوشش اور کاوش کے باوجود اس کے ارادے محض ارادے رہتے ہیں، تب اسے احساس ہوتا ہے کہ اس دنیا کے نظام میں میرے ارادوں کی تکمیل صرف میری جدوجہد پر نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم پر موقوف ہے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے:

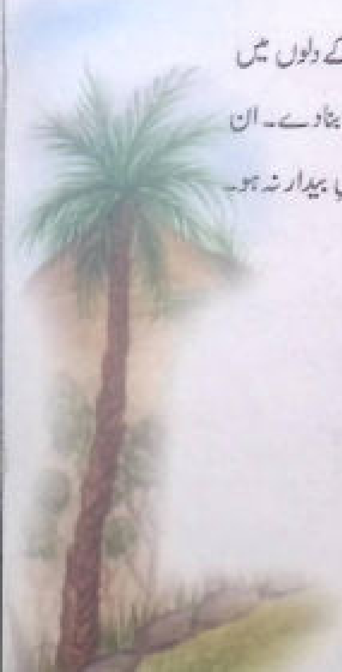
عَرَفْتُ رَبِّیْ بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ

(میں نے اپنے ارادوں کے ٹوٹ جانے سے اپنے رب کو پہچانا)

چنانچہ علامہ اقبالؒ نے اونٹ اور اس کے بچے کی گفتگو کے پیرائے میں جو حقیقت پیش کی ہے وہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس قول کی تفسیر ہے اور اس کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ انسان بالعموم اور مسلمان بالخصوص کے دل میں اس بات کا یقین پیدا ہونا چاہیے کہ یہ ساری کائنات اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت اور تصرف و اختیار میں ہے اور جب تک اللہ تعالیٰ کی توفیق و تائید شامل حال نہ ہو کوئی انسان خواہ وہ کتنا ہی عالم فاضل، کیسا ہی باوسائل اور کیسی ہی ہمت و جرأت کا مالک ہو، زندگی میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ یہ وہ تعلیم ہے جو صحیح اور حقیقی تعلیم ہے اور جسے اقبال جوانانِ ملت اور قوم کے شاہین بچوں کو دینا چاہتے ہیں۔ دیکھا جائے تو یہ وہ علم ہے جو سارے علوم کی بنیاد ہے۔ جسے یہ بنیادی علم حاصل ہو گیا۔ اسے گویا سارے علوم حاصل ہو گئے۔ بقول اکبر الہٰ آبادی ؎

تعلیم مذہبی کا خلاصہ یہی تو ہے
سب مل گیا اسے، جسے اللہ مل گیا

اسی لیے وہ قوم کے نونہالوں کو ایسی تعلیم دینے پر زور دیتے ہیں جو ان کے دلوں میں عشق کا سوز و گداز پیدا کرے اور ان کی زندگیوں کو تب و تاب جاودانہ کی تصویر بنا دے۔ ان کے نزدیک ایسے مسلمان سے اللہ کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہتا جس کے سینے میں دلِ بیدار نہ ہو۔





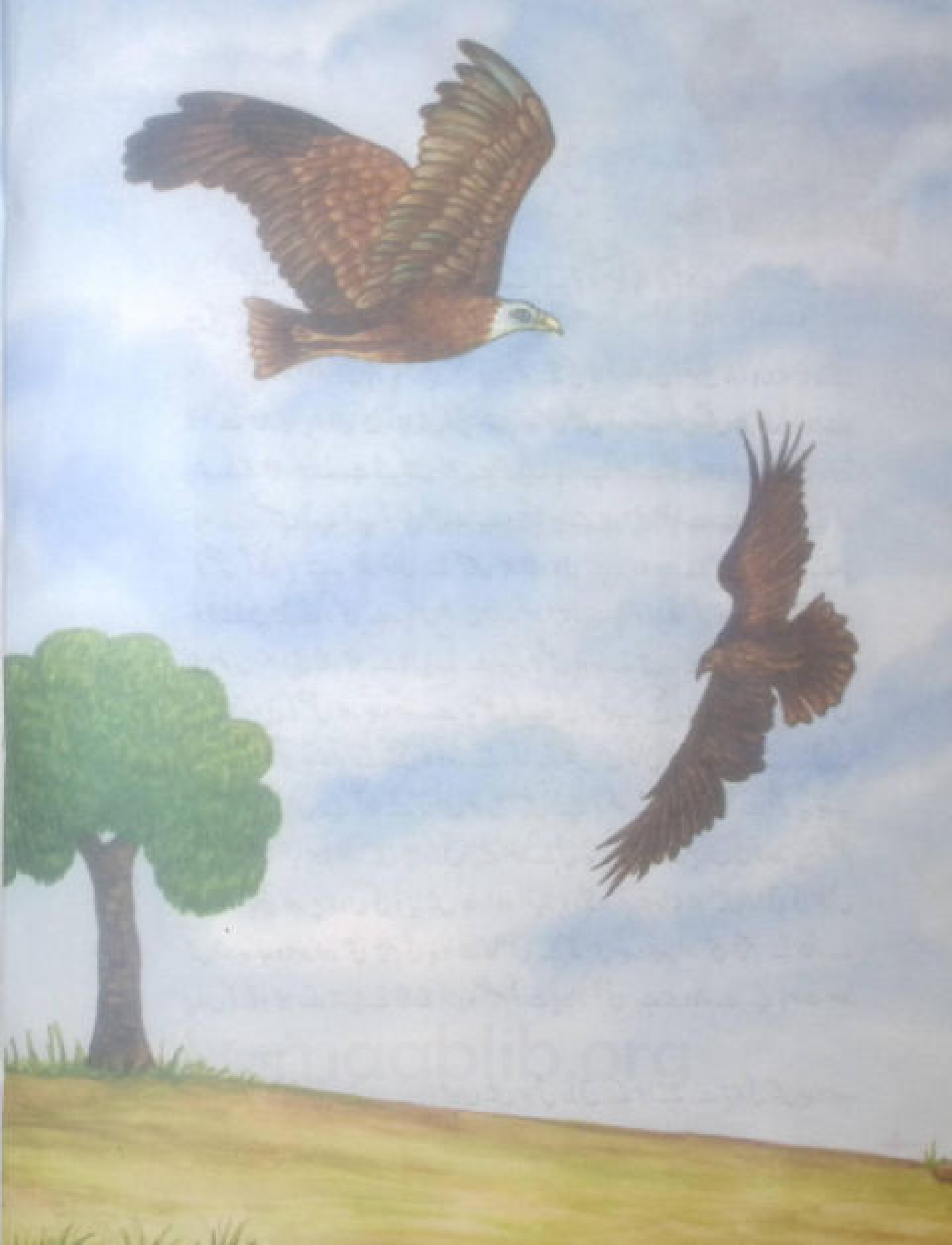
تلاشِ رزق

ایک سن رسیدہ اور تجربہ کار عقاب نے ایک نوجوان باز کو نصیحت کرتے ہوئے اور زندگی کے نشیب و فراز سمجھاتے ہوئے کہا۔

"دیکھو! اگر کوئی باز یا شاہین اپنا پیٹ بھرنے کی خاطر کوٹھوں کوٹھوں مارا مارا پھرتا رہے تو اسے شکاری پرندوں کی دنیا میں کوئی مقام حاصل نہیں ہو سکتا۔ کسی مٹھی بھر پروں والے پرندے کا شکار کرنے سے تو یہ کہیں بہتر ہے کہ ایک باز اپنے گھونسلے میں بھوکا مر جائے۔

تمھیں اپنے آپ کو نگاہِ محرمانہ سے دیکھنا چاہیے اور اپنی حقیقت سے آگاہ ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو نگاہ دی ہے۔ وہ ہمارے حق میں تازیانے یا کوڑے کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس طرح ایک گھوڑا تازیانہ یا کوڑا کھا کر تیز دوڑنے لگتا ہے، اسی طرح ہم اپنی نگاہِ تیز کے تازیانے سے سرگرمِ عمل ہو جاتے ہیں۔ کیوں کہ ہماری نگاہ ہمیں اپنا رزق اپنی کوشش اور جدوجہد سے حاصل کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ خالقِ کائنات نے ہر جاندار کے رزق کا ذمہ لے رکھا ہے لیکن اسی خالقِ کائنات نے ہمیں رزق کی تلاش کا جذبہ اس لیے بخشا ہے کہ اس طرح ہمیں اپنے پر کھولنے کا بہانہ مل سکے اگر یہ جذبہ ہمیں نہ بخشا گیا ہوتا اور ہمیں اپنا رزق بیٹھے بٹھائے مل جاتا تو ہمارے پروں کی قوتِ پرواز ختم ہو کر رہ جاتی اور پرندوں کی دنیا میں ہمارا وہ امتیاز و افتخار ختم ہو جاتا جو ہمیں رزق کی تلاش میں شدید جدوجہد اور سعیِ پیہم کی بدولت حاصل ہے کہ اسی جدوجہد اور سعیِ پیہم نے ہمارے پروں کو نگاہِ تیز کے تازیانے لگا لگا کر وہ عظیم قوتِ پرواز بخشی ہے جو ہمارے لیے باعثِ صد فخر و ناز ہے۔"

علامہ اقبالؒ نے ان دو رُباعیوں میں تلاشِ رزق کے حوالے سے زندگی میں جدوجہد





کی اہمیت واضح کی ہے اور اس کے لیے اپنی پسندیدہ علامت اور پرندوں کی دنیا کے درویش ''شاہین'' کی زندگی کو بطور مثال پیش کیا ہے۔ ایک تجربہ کار عقاب دوسرے عقاب کو زندگی کے اسرار و رموز سے آگاہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ایک شاہین کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ اپنا پیٹ بھرنے کے لیے دوسرے کم حیثیت اور کم پرواز پرندوں کی طرح کوٹھوں کوٹھوں مارا مارا پھرے۔ اس طرح کی کوٹھوں کوٹھوں اڑ کر چڑیوں جیسے مٹھی بھر پر رکھنے والے پرندوں کا شکار کرنے سے تو بہتر ہے کہ وہ اپنے گھونسلے میں پڑا بھوکا مرجائے۔ ؎

اے طائرِ لاہوتی، اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی!

تجربہ کار عقاب دوسرے عقاب کو مزید نصیحت کرتے ہوئے اس شاہین کی زندگی میں نگاہ کی تیزی اور قوتِ پرواز کی اہمیت اور دونوں کے باہمی تعلق سے آگاہ کرتا ہے کہ شاہین کو تیز نگاہ اس لیے دی گئی ہے کہ یہ تیز نگاہ اس کے پر کھولنے کا بہانہ بن جائے۔ یہ تیز نگاہ نہ ہوتی تو شاہین کو غیر معمولی بلندی اور فاصلے سے اپنا شکار نظر نہ آتا۔ اسے شکار نظر نہ آتا تو وہ پرواز کی طرف مائل نہ ہوتا۔ وہ پرواز کی طرف مائل نہ ہوتا تو آہستہ آہستہ اس کے پروں کی قوتِ پرواز بالکل ختم ہوکر رہ جاتی۔ چنانچہ نگاہ کا تازیانہ کھا کر وہ پرواز اور جدو جہد کے لیے سرگرم ہوتا ہے اور سرگرم رہتا ہے۔ اس نگاہ کے تازیانوں کی بدولت اسے شکار سے زیادہ شکار کے لیے جدو جہد میں مزا ملتا ہے۔

اسی سے ملتی جلتی بات علامہ اقبالؒ نے اپنی نظم ''نصیحت'' میں کہی ہے۔ اس نظم میں ایک بوڑھا عقاب اپنے بچے سے کہتا ہے کہ اے بیٹے! خدا تیرے بازوؤں کو ایسی قوت عطا کرے کہ اس کی برکت سے تیرے لیے آسمانوں کی رفعتوں تک پرواز کرنا آسان ہوجائے۔

اے بیٹے! جوانی اپنے ہی لہو کی آگ میں جلنے کا دوسرا نام ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تو برابر محنت و مشقت کرتا رہے اور تیرے خون کی حرارت تجھے ہر وقت جدو جہد میں لگائے

رکھے۔ جب تو ہر گھڑی، ہر لحظہ جدوجہد میں مصروف رہے گا تو زندگی کی کڑواہٹ تیرے لیے شہد بن جائے گی۔ تجھے جتنی مشکلات پیش آئیں گی۔ حل ہوتی جائیں گی اور تجھے اپنی جدوجہد میں ایک خاص لطف ملے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک شاہین کو کبوتر پر جھپٹنے اور حملہ کرنے میں جو مزا ملتا ہے وہ مزا تو شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں ہوتا، اس لیے کہ زندگی کی جو لذت جدوجہد میں ہے، وہ جدوجہد سے حاصل کی ہوئی چیزوں میں نہیں۔

کبوتر پر جھپٹنے اور حملہ کرنے کے مزے کی بات علامہ اقبالؒ نے اپنی ایک دوسری نظم ''شاہین'' میں ایک اور انداز سے کہی ہے بلکہ خود شاہین کی زبان سے کہلوائی ہے۔ ؎

جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ شاہین کی مختلف خصوصیات کو پیش کرنے سے علامہ اقبالؒ کا بڑا مقصد یہی ہے کہ وہ ملتِ اسلامیہ کے نونہالوں کو شاہین بچوں کی خصوصیات و اوصاف کا آئینہ دار دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان عوام اور خاص طور پر مسلمان نوجوان شاہین کی طرح غیرت مند ہوں۔ رزق کے لیے دوسروں کے در پر جانے کی بجائے اپنی ہمت اور محنت سے خود اپنا رزق حاصل کریں۔ اپنی زندگیوں کو جدوجہد اور حرکت و عمل کا ایسا نمونہ بنادیں کہ ان کی زندگیاں سراپا جدوجہد اور سرتاپا عمل بن کر رہ جائیں۔ کوئی مقام ان کے لیے ستانے کا مقام نہ ہو اور کوئی منزل ان کے سفر کا اختتام نہ ہو۔ ؎

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

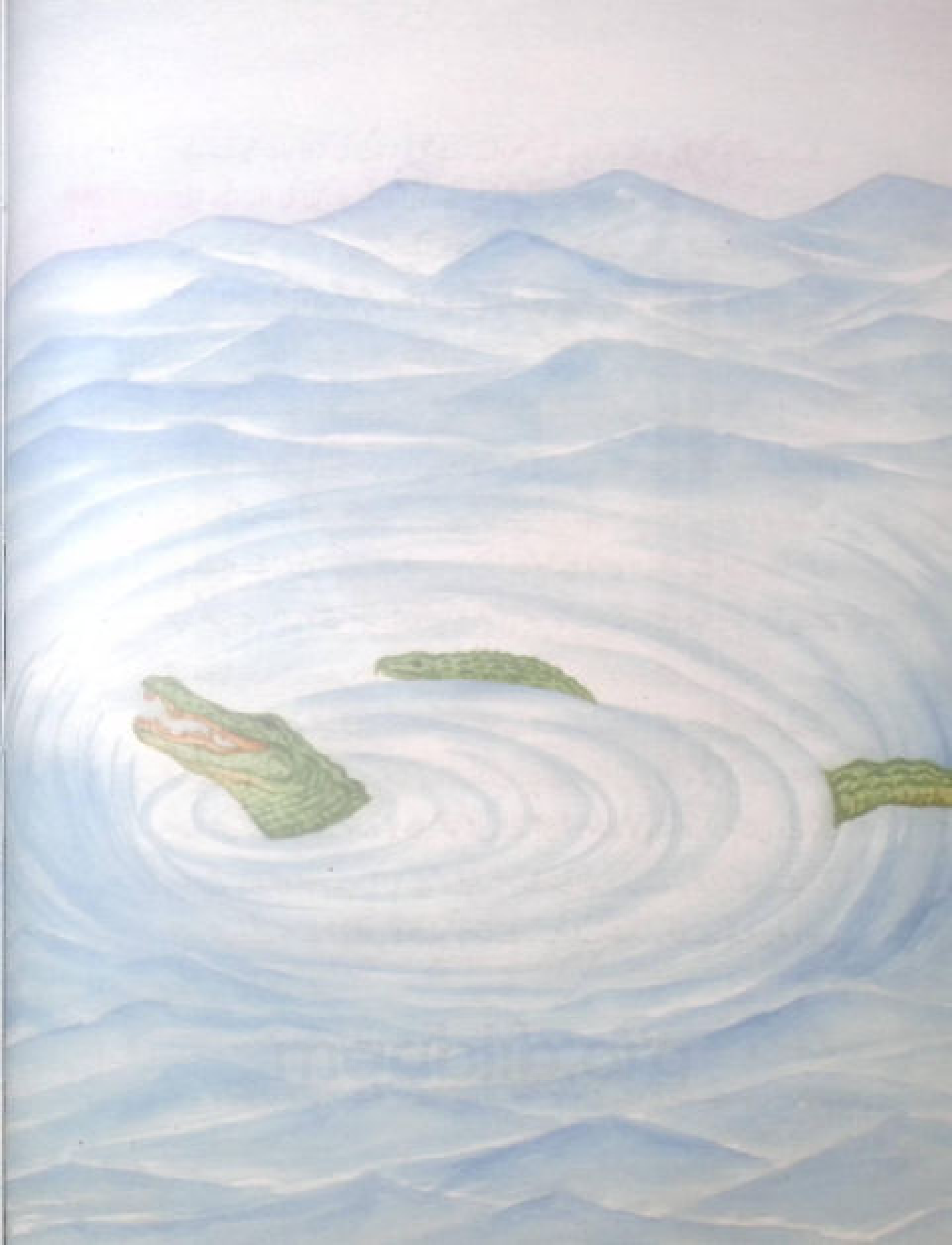
نہنگ با بچۂ خویش

سمندر میں ایک مگرمچھ نے اپنے بچے کو زندگی کے اسرار و رموز سے آگاہ کرتے ہوئے ہوئے بڑی اچھی بات کہی۔ اس نے کہا۔

''اے بیٹے! ہمارے مذہب میں کنارا حرام ہے۔ ساحل کی تمنا اور جستجو کرنا یا ساحل پر زندگی بسر کرنا یہ دونوں باتیں ہمارے لیے حرام ہیں۔ اس لیے اے میرے بیٹے! تجھے لازم ہے کہ ساحل سے ہمیشہ اجتناب کرے اور اس سے دور رہتے ہوئے موجوں کے ساتھ کش مکش کرتے ہوئے زندگی بسر کرے۔ تو اس اہم حقیقت کو اپنے ذہن میں بٹھا لے کہ یہ سارا سمندر ہمارا گھر ہے۔ اس وسیع سمندر میں ہم اپنی مرضی اور سہولت کے مطابق جہاں چاہے آجا سکتے ہیں۔

میرے بیٹے! یہ بھی یاد رکھ کہ اگرچہ نظر یہ آتا ہے کہ تو سمندر میں ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ تُو سمندر میں نہیں ہے بلکہ سمندر تیری ذات میں ہے۔ تیرا وجود سمندر میں نہیں ہے بلکہ سمندر کا وجود تجھ میں ہے یعنی تُو سمندر کا پابند اور غلام نہیں ہے بلکہ سمندر تیرا پابند اور غلام ہے۔ اس لیے کہ تیری فطرت میں اللہ تعالیٰ نے یہ جوہر رکھ دیا ہے کہ تو سمندر میں اٹھنے والے طوفانوں کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ نہ صرف مقابلہ کر سکتا ہے بلکہ ان طوفانوں پر غالب بھی آسکتا ہے۔

اے بیٹے! یہ راز کی بات جان لے کہ اگر تو سمندر کے طوفان سے گریز کر کے کسی گوشۂ عافیت کی تلاش کرے گا تو یہی سمندر جو حقیقتاً تیرا غلام ہے، تیرے لیے وبال اور تباہی



کا باعث بن جائے گا۔اور یہ بھی جان لے کہ اس سمندر کے طوفان تیری صلاحیتوں کو پروان چڑھانے اور قوتوں کو نشو ونما دینے کا سامان ہیں۔ اس لیے تجھے ایک لمحے کے لیے بھی ان سے گھبرانا، کترانا یا منہ نہیں موڑنا چاہیے کیونکہ اگر سمندر میں طوفان کا وجود باقی نہ رہے تو یہی تیرے لیے موت کا پیغام اور ہلاکت کا سامان بن جائے گا کیوں کہ سمندر کے طوفانوں کی عدم موجودگی میں تیری زندگی جدوجہد اور کش مکش سے محروم ہو جائے گی اور ایسی زندگی جو کش مکش اور جدوجہد سے محروم ہو، موت ہی کا دوسرا نام ہے۔"

علامہ اقبالؒ نے ان دو رُباعیوں میں زندگی میں جدوجہد اور کش مکش کی اہمیت واضح کی ہے۔ جس طرح "تلاشِ رزق" میں ایک تجربہ کار عقاب دوسرے عقاب کو زندگی کے اسرار و رموز سے آگاہ کرتا ہے۔اسی طرح ان رُباعیوں میں ایک مگر مچھ اپنے بچے کو سمندر اور سمندر کے طوفانوں کے حوالے سے زندگی میں جدوجہد اور سخت کوشی کی اہمیت سے آگاہ کرتے ہوئے اسے بتاتا ہے کہ آرام طلبی، راحت پسندی اور عافیت کوشی ہمارے مذہب میں حرام ہے۔اس لیے تجھے ساحل سے دور رہتے ہوئے اور موجوں سے لڑتے ہوئے زندگی گزارنی چاہیے۔ سارا سمندر ہمارا وطن ہے اور ہم اس سمندر میں اپنی مرضی کے مطابق جہاں جی چاہے آجا سکتے ہیں۔

مگر مچھ اپنے بچے کو مزید بتاتا ہے کہ تو سمندر میں نہیں بلکہ سمندر تجھ میں ہے یعنی تو سمندر کا غلام نہیں بلکہ سمندر تیرا غلام ہے اور اس سمندر میں جو طوفان نظر آتے ہیں، وہ اس لیے ہیں کہ تیری فطرت میں طوفانوں سے مقابلہ کرنے کا جوہر زیادہ سے زیادہ پروان چڑھ سکے۔ یہ طوفان حقیقت میں تیرے ہی فائدے کے لیے ہیں۔کیوں کہ سمندر میں طوفان نہ ہوں تو تیری زندگی جدوجہد اور کش مکش سے محروم ہو جائے گی۔تو آرام طلب، سست اور

عافیت پسند ہو جائے گا اور تیری زندگی تیرے حق میں موت سے بدتر ہو جائے گی۔

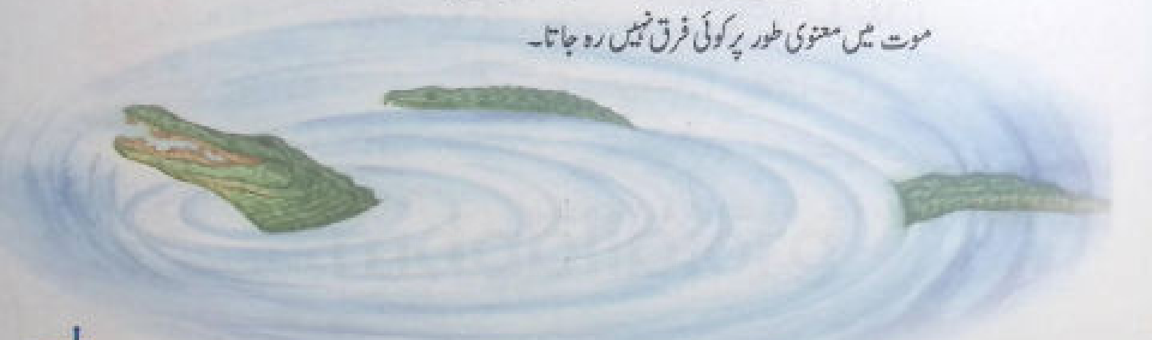
جس طرح علامہ اقبالؒ نے شاہین کی مختلف خصوصیات کو اپنی شاعری کا موضوع اس لیے بنایا کہ وہ ملتِ اسلامیہ کے نونہالوں کو شاہین بچوں کی صفات و خصوصیات کا آئینہ دار دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس طرح ان رباعیات میں بھی ان کا حقیقی خطاب ملتِ اسلامیہ کے نونہالوں سے ہے۔ وہ مگرمچھ کی اپنے بیٹے کو نصیحت کے حوالے سے مسلمان نوجوانوں کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مسلمان کے لیے آرام طلبی، راحت پسندی اور عافیت کوشی سراسر حرام ہے۔ اسے تو آرام پسندی سے کنارا کر کے ہر لحظہ دنیاوی مشکلات کا مقابلہ کرنا چاہیے اور اس طرح جدوجہد اور کش مکش کی زندگی گزارتے ہوئے اپنی زندگی کے جوہر یعنی خودی کو پروان چڑھانا چاہیے۔ مسلمان کے لیے ساری دنیا وطن کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر وہ ایک جگہ یا ایک خطے میں اپنی مرضی اور شان کے مطابق زندگی بسر نہ کر سکے تو دنیا کے کسی دوسرے خطے کو اپنا وطن یا ٹھکانا بنا سکتا ہے۔ ؎

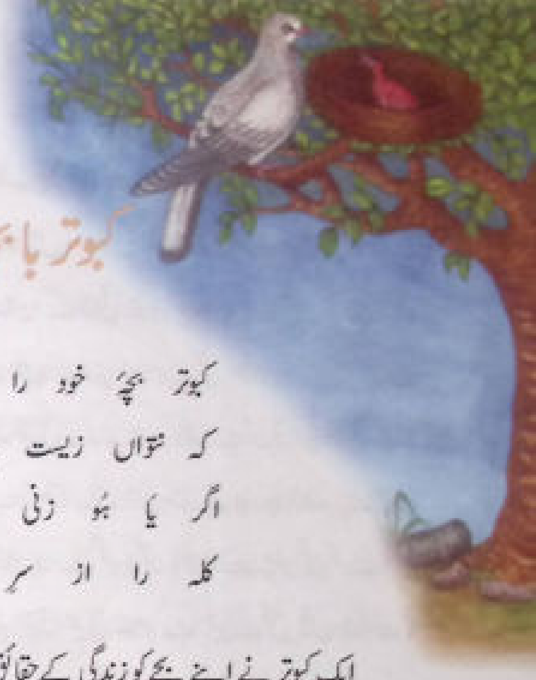
ہر ملک، ملک ماست کہ ملکِ خدائے ماست

دوسری رُباعی میں مگرمچھ اپنے بچے کو بتاتا ہے کہ تو سمندر میں نہیں ہے بلکہ سمندر تجھ میں ہے یعنی تو سمندر کا غلام نہیں بلکہ سمندر تیرا غلام ہے۔ یہاں بھی علامہ اقبالؒ نے مگرمچھ اور سمندر کے حوالے سے مسلمان نوجوانوں کو یہ بات بتانے کی کوشش کی ہے کہ اے نونہالِ ملتِ اسلامیہ! تو دنیا میں نہیں ہے، بلکہ دنیا تجھ میں ہے۔ یعنی تو دنیا کا پابند نہیں یا غلام نہیں ہے بلکہ دنیا تیری پابند اور غلام ہے۔ یہی بات وہ ایک دوسری جگہ اس طرح فرماتے ہیں۔ ؎

نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے، تو نہیں جہاں کے لیے

ارشادِ خداوندی بھی یہی ہے کہ اے انسان! آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ بھی ہے وہ تیرے لیے مسخر کر دیا گیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں آسمانوں اور زمینوں کا نظام خالقِ کائنات نے اس نہج پر استوار کیا ہے کہ اس سے انسان کے ذاتی جوہر پروان چڑھ سکیں۔ اسی لیے اقبال مسلمان نوجوانوں کو یہ بات سمجھاتے ہیں کہ دنیا اور دنیا کی مشکلات حقیقتاً تیرے فائدے کے لیے ہیں۔ تیری فطرت میں اللہ تعالیٰ نے یہ جوہر رکھا ہے کہ تو ان مشکلات کا مقابلہ کر سکتا ہے اور مقابلہ کر کے ان پر غالب آ سکتا ہے۔ اس مقابلے اور جدوجہد سے تیری خودی کی نشوونما ہوتی ہے۔ اگر تو دنیا کی مشکلات سے گھبرا کر یا ان سے پہلوتہی کر کے کسی گوشۂ عافیت کی تلاش کرے گا تو یہی دنیا جو حقیقتاً تیری غلام ہے، تیرے حق میں ہلاکت کا سامان بن جائے گی اور تو دنیا کی امامت کے مقام سے گر کر دنیا کا غلام بن جائے گا۔ پس اے مسلمان! تجھے مشکلات سے ہراساں نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ یہ مشکلات تو تیری صلاحیتوں کو پروان چڑھانے اور تیری خودی کی نشوونما کا سامان ہیں۔ اس لیے تجھے ان سے ذرا بھی گھبرانا نہیں چاہیے۔ اگر دنیا میں مصائب و مشکلات کا وجود باقی نہ رہے تو یہی دنیا تیرے حق میں موت کا پیغام بن جائے گی۔ کیوں کہ جب زندگی میں مشکلات نہ ہوں گی تو جدوجہد اور کش مکش بھی نہ ہوگی اور جس زندگی میں جدوجہد اور کش مکش نہ ہو، اس میں اور موت میں معنوی طور پر کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔





کبوتر با بچۂ خود

کبوتر بچۂ خود را چہ خوش گفت
کہ نتواں زیست با خوے حریری
اگر یا ہو زنی از مستی شوق
کلہ را از سرِ شاہیں بگیری

ایک کبوتر نے اپنے بچے کو زندگی کے حقائق سے آگاہ کرتے ہوئے بڑی ہی اچھی بات کہی۔ اس نے کہا:

"اے میرے بیٹے! اگر تو عیش و عشرت کا دلدادہ بن جائے۔ اگر تو آرام طلب اور عیش پسند ہو جائے تو تیرے لیے دنیا میں زندہ رہنا ناممکن ہو جائے گا۔ اس دنیا میں وہی زندہ رہ سکتا ہے جو عیش و عشرت سے کنارا کر لے، جو آرام طلبی اور عیش پسندی سے کوسوں دور بھاگے، اور جس کے شب و روز جدوجہد، محنت اور سخت کوشی کی تصویر ہوں۔ تو زبان سے تو دن رات "یا ہُو! یا ہُو!" کہتا ہے لیکن اگر تو دل کی گہرائیوں سے یا ہو کہے، اگر تو ذوق و شوق کی مستی میں ڈوب کر یا ہُو کا نعرہ لگائے، اگر تو عشق کی کیفیت سے سرشار ہو کر دل سے یا ہو کہے تو اے میرے بیٹے! تو کبوتر جیسا کمزور پرندہ ہونے کے باوجود شاہین کے سر سے پرندوں کی دنیا کی بادشاہت کا تاج چھین سکتا ہے۔ اگر تو زبان کی بجائے دل سے یا ہو کہے تو دنیا کی بڑی سے بڑی سرفرازی تیرا مقدر بن سکتی ہے۔"



علامہ اقبالؒ نے اس رُباعی میں کبوتر کی اپنے بچے سے گفتگو کے پیرائے میں زندگی میں سخت کوشی، ذوق وشوق اور عشق کی اہمیت واضح کی ہے۔ جس طرح "تلاشِ رزق" میں ایک تجربہ کار عقاب دوسرے عقاب کو زندگی کے اسرار و رموز سے آگاہ کرتا ہے اور جس طرح "نہنگ با بچۂ خویش" میں ایک مگرمچھ اپنے بچے کو سمندر اور سمندر کے طوفانوں کے حوالے سے زندگی میں جدوجہد اور سخت کوشی کی اہمیت سے آگاہ کرتا ہے۔ اسی طرح اس نظم میں ایک کبوتر اپنے بچے کو درسِ زندگی دیتے ہوئے بتاتا ہے کہ اس دنیا میں صرف وہی زندہ رہ سکتا ہے۔ جس کی زندگی جدوجہد اور سخت کوشی سے عبارت ہو لیکن آرام طلبی اور عیش پسندی کا راستہ اختیار کر کے زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

جس طرح خوش اعتقاد لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اُلو "ہُو ہُو" یا" اللہ ہُو" کا ورد کرتا ہے، یا تیتر "سبحان تیری قدرت" کہتا ہے، اسی طرح کبوتر کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ "یا ہُو" کا ورد کرتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے عام لوگوں کے اس خیال کو سامنے رکھتے ہوئے اس نکتے کو کبوتر کی زبان سے ادا کروایا ہے کہ زبان سے "یا ہُو یا ہُو" کا ورد کرتے رہنا کوئی معنی نہیں رکھتا جب تک عشق اور جذب و مستی سے سرشار ہو کر دل سے "یا ہُو" کا ورد نہ کرے، یعنی محض زبان سے "یا ہُو، یا ہُو" کہتے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں، دل سے "یا ہُو" کہا جائے تو اس کا اثر ظاہر ہوتا ہے اور یوں ظاہر ہوتا ہے کہ کبوتر جیسا کمزور پرندہ شاہین جیسے پرندے سے پرندوں کی دنیا کی بادشاہت کا تاج چھین لیتا ہے۔

"تلاشِ رزق" اور "نہنگ با بچۂ خویش" کی طرح اس رُباعی میں بھی علامہ اقبالؒ نے کبوتر اور اس کے بچے کے حوالے سے مسلمان نوجوان کو یہ بات سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ تیرے لیے عیش و آرام کی زندگی اختیار کرنا موت کے مترادف ہے۔ دنیا میں وہ قوم کبھی

زندہ نہیں رہ سکتی جو تن آسانی، عیش و عشرت اور آرام طلبی کی راہ پر چل رہی ہو۔ اس دنیا میں صرف وہی قوم زندہ رہ سکتی ہے جس کی زندگی مسلسل جدو جہد اور سخت کوشی سے عبارت ہے۔

جدو جہد اور سخت کوشی کے ساتھ ساتھ علامہ اقبالؒ نے اس رُباعی میں عشق، اور مستیِ شوق کی اہمیت بھی واضح کی ہے اور بتایا ہے کہ اے مردِ مسلماں! صرف زبان سے اللہ اللہ کیے جانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اگر تو زبان سے اللہ کے ایک، اور سب سے بڑا ہونے کی گواہی دیتا ہے لیکن یہ گواہی تیرے دل کی گواہی نہیں تو اس سے تجھے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ لیکن اگر تو اللہ تعالیٰ کے عشق سے سرشار ہو کر اللہ کے ایک، اور سب سے بڑا ہونے کی گواہی دے اور زبان کی بجائے دل سے یا ہُو کہے تو دنیا کی زبردست سے زبردست قوم پر غالب آسکتا ہے۔ اگر تو شوق کی مستی میں ڈوب کر اللہ اکبر کا نعرہ لگائے تو تیرا یہ نعرہ باطل کے ایوانوں میں زلزلے برپا کرسکتا ہے اور وقت کے بڑے بڑے فرعونوں کے سر تیرے قدموں میں جھکا سکتا ہے۔



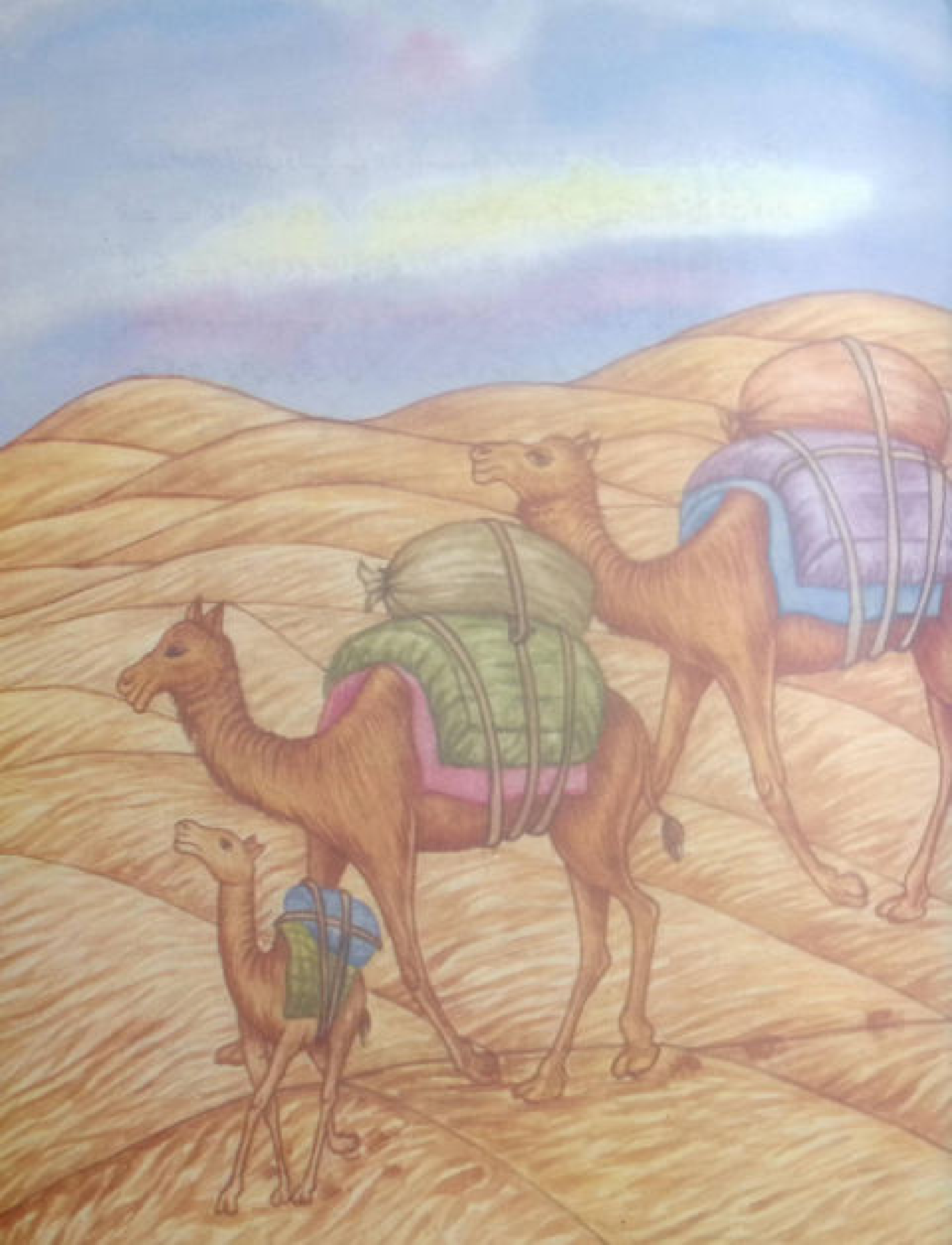
شُتر با بچۂ خُود

چہ خوش گفت اشترے با کرۂ خویش
خنک آں کس کہ دانہ کار خود را
بگیر از ما کہن صحرا نورداں
بہ پشتِ خویش بروں بار خود را

ایک اونٹ نے اپنے بچے کو زندگی میں اپنے فرائض منصبی ادا کرنے اور اپنا کام خود انجام دینے کی اہمیت سمجھاتے ہوئے بہت عمدہ بات کہی۔ اس نے کہا۔

"اے میرے بیٹے! وہ شخص بہت ہی خوش نصیب ہے جو اپنے کام کو سمجھتا ہے، جو اپنے فرائض منصبی سے آگاہ ہے اور ان فرائضِ منصبی کو خوشی خوشی انجام دیتا ہے۔ وہ اپنے کام کو اپنے لیے بوجھ نہیں سمجھتا بلکہ اس کام کو کر کے اسے خوشی محسوس ہوتی ہے اور اپنے فرائض منصبی کی صحیح طور پر بجا آوری ہی اس کے لیے دل کے چین، آرام اور سکون کا باعث بنتی ہے۔

"اے بیٹے! ہم زمانہ قدیم سے صحراؤں میں بوجھ اٹھا کر چلتے آ رہے ہیں۔ اپنا بوجھ اپنی پیٹھ پر لاد کر چلنا کیا معنی رکھتا ہے، اپنا بوجھ خود اٹھانے کی زندگی میں کیا اہمیت ہے، اسے ہم جانتے ہیں۔ تو ہم سے یہ بات سیکھ لے۔ ایک تو ہی نہیں اس دنیا میں جو کوئی بھی اپنے کام اور اپنے فرائض منصبی کی اہمیت سے آگاہ ہونا چاہتا ہے، جو اپنا بوجھ خود اٹھانے کی حقیقی لذت سے آشنا ہونا چاہتا ہے، وہ ہماری زندگی کو سامنے رکھے۔ وہ ہمارے طرزِ عمل کی پیروی



کرے اور ہماری روش کو اپنے لیے نمونہ بنالے۔ ہم صحراؤں میں سفر کرنے والے ہی اس حقیقی لذت سے آشنا ہیں جو اپنا بوجھ خود اٹھانے والوں کو ملتی ہے۔ صرف یہی نہیں ہماری زندگی کا راز بھی یہی ہے کہ ہم اپنا بوجھ خود اپنی پیٹھ پر اٹھا کر چلتے ہیں اور اپنے اس کام سے کبھی جی نہیں چراتے اور نہ اسے اپنے لیے باعثِ ننگ و عار سمجھتے ہیں۔ ہم زندگی کی اس اہم ترین حقیقت سے آگاہ ہیں کہ اس دنیا میں کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا اور جو اپنا بوجھ خود اٹھانے سے پہلوتہی کرتا ہے۔ جو اپنے کام سے جی چراتا ہے یا اپنے فرائض منصبی سے غفلت برتتا ہے تباہی، ہلاکت اور فنا اس کا مقدر بن جاتی ہے۔''

علامہ اقبالؒ نے اس رباعی میں اونٹ کی اپنے بچے کو نصیحت کے پیرائے میں زندگی میں اپنا بوجھ خود اٹھانے اور اپنا کام خود انجام دینے کی اہمیت واضح کی ہے۔ اونٹ کی زندگی کا یہ رخ ایک لحاظ سے مثالی حیثیت رکھتا ہے کہ وہ بھاری بھاری بوجھ اپنی پیٹھ پر اٹھائے آگ کی طرح تپتے ہوئے صحراؤں کا سفر کرتا ہے اور اپنے اس فرضِ منصبی سے کبھی پہلوتہی نہیں کرتا۔ چنانچہ اونٹ اپنے بچے کو نصیحت کرتے ہوئے اپنی زندگی کا یہی پہلو نمایاں کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ شخص بڑا ہی مبارک اور خوش نصیب ہے جو اپنی زندگی میں اپنے کام کو خوش اسلوبی سے انجام دیتا ہے اور اپنے فرائضِ منصبی احسن طریقے سے بجا لاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنے بچے کو اپنا بوجھ خود اٹھانے کی تلقین کے سلسلے میں اپنی ذات اور اپنے کردار کو بطور نمونہ پیش کرتا ہے کہ جس کسی کو اپنے کام اور اپنے فرائضِ منصبی کی اہمیت سے آگاہی درکار ہو، وہ ہم سے یہ بات سیکھ لے۔ جو شخص بھی ہماری زندگیوں پر غور کرے گا۔ اسے معلوم ہو جائے گا کہ زندگی میں اپنا بوجھ خود اٹھانے سے بڑھ کر اچھا کام کوئی نہیں۔ دنیا میں کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ دنیا میں سرفرازی اس کا نصیب بنتی ہے جو اپنے کام کو اپنے لیے بوجھ نہیں سمجھتا اور جسے اپنے فرائضِ منصبی انجام دے کر دلی خوشی محسوس ہوتی ہے۔

حکایاتِ پیامِ مشرق

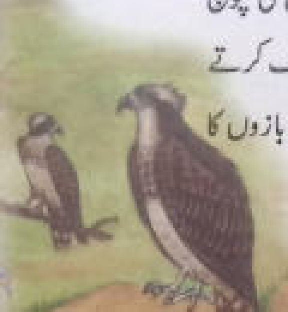


پندِ باز با بچۂ خویش

ایک باز نے اپنے بچے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا۔

"اے میرے بیٹے! ساری دنیا کے بازوں کی پیدائش ایک ہی جوہر سے ہوئی ہے۔ وہ قدوقامت یا رنگ میں ایک دوسرے سے مختلف ہوں تو ہوں لیکن ذاتی خواص کے لحاظ سے سب یکساں ہیں، اگرچہ دیکھنے میں وہ سب مُشتِ پَر ہوتے ہیں لیکن شیروں کا سا دل رکھتے ہیں۔ پس اے میرے بیٹے! تجھے لازم ہے کہ تو اپنے اندر بازوں کی صفات پیدا کرے۔ تُو نیکی اختیار کر، اپنی تدابیر میں پختگی کا رنگ پیدا کر اور اپنے اندر جرأت، ہمّت اور غیرت کا مادہ پیدا کر۔ تیری جرأت، ہمت اور غیرت کا تقاضا یہ ہے کہ تو صرف اپنا مارا ہوا شکار کھائے اور دوسرے کا مارا ہوا شکار کسی صورت میں بھی نہ کھائے۔ چڑیا جیسے معمولی پرندے کو شکار کرنا بھی تیری شان کے شایان نہیں ہے۔ تُجھے لازم ہے کہ جب بھی شکار کرے، کسی بڑے پرندے کو شکار کرے۔

اے میرے بیٹے! تیتر، جنگلی مرغ اور مینا سے بھی میل جول پیدا نہ کرنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی عادتیں تیرے اندر سرایت کر جائیں۔ ہاں اُن کا شکار کرنے کی نیت سے اُن کے قریب جانے میں حرج نہیں۔ بات یہ ہے کہ یہ تمام پرندے نہایت پست فطرت اور بُزدل ہوتے ہیں۔ ان کی فطرت کی پستی ایک اسی بات سے ظاہر ہے کہ جب ان پرندوں کی چونچ گندی چیزوں سے آلودہ ہوجاتی ہے تو یہ عام طور پر اپنی چونچ کو مٹی سے رگڑ کر صاف کرتے ہیں۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان پرندوں کا تعلق زمین سے ہے جبکہ بازوں کا





تعلق فضائے آسمانی سے ہے۔ یہ پرندے زمین پر سے دانہ چگتے ہیں جبکہ آج تک کسی نے کسی باز کو زمین پر سے دانہ چگتے یا مٹی سے چونچ صاف کرتے نہیں دیکھا۔ اس لیے کہ یہ دونوں باتیں باز کی شان کے خلاف ہے۔

اے میرے بیٹے! جو باز اُن پرندوں کا طرزِ حیات اختیار کرلیتا ہے جن کو وہ شکار کرتا ہے، تو آخر کار وہ بدنصیب باز خود اُن پرندوں کا شکار ہوجاتا ہے۔ میں نے بہت سے شکروں کو اس لیے تباہ ہوتے دیکھا ہے کہ انہوں نے اُن پرندوں کی صحبت اختیار کرلی تھی جو زمین پر دانہ چگتے ہیں۔ پس اے بیٹے! اپنی خودی کی حفاظت کر۔ دلیری، درشتی، سختی اور تنومندی کی صفات اپنے اندر پیدا کر۔ یاد رکھ کہ نازک اور نرم جسم بٹیر کا ہوتا ہے نہ کہ باز کا۔ تجھے لازم ہے کہ اپنے اعصاب میں ہرن کے سینگوں کی سی سختی پیدا کرلے۔ اس دُنیا میں وہی خوش و خرم اور کامیاب و کامران زندگی بسر کرسکتا ہے جو سخت، جفاکش اور پُر دم ہو۔

اے میرے بیٹے! خون کا ایک قطرہ لعلِ ناب سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ دیکھنے میں تو قطرۂ خون اور لعلِ ناب دونوں سرخ ہوتے ہیں لیکن اگر یہ دونوں تیرے سامنے ہوں تو تجھے لازم ہے کہ لعلِ ناب کی بجائے قطرۂ خون کا انتخاب کرے۔ کیوں کہ تیرے حق میں لعلِ ناب کی بجائے قطرۂ خون ہی بہتر ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھ کہ جس طرح ہرن گلے کی صورت میں رہتے ہیں یا جس طرح بھیڑیں ریوڑ کی صورت میں ایک ساتھ رہتی ہیں اس طرح کی رَوش تجھے اختیار نہیں کرنی چاہیے۔ تجھے لازم ہے کہ دوسرے بازوں کے ساتھ مل جل کر زندگی بسر نہ کرے بلکہ اپنے بزرگوں اور آباؤ اجداد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے خلوت اور تنہائی کی زندگی بسر کرے۔ شکاری پرندے تو تنہا ہی زندگی بسر کرتے ہیں۔ کیوں کہ اسی طرح اُن کے اندر اپنے زورِ بازو پر اعتماد کا رنگ پیدا ہوتا ہے۔

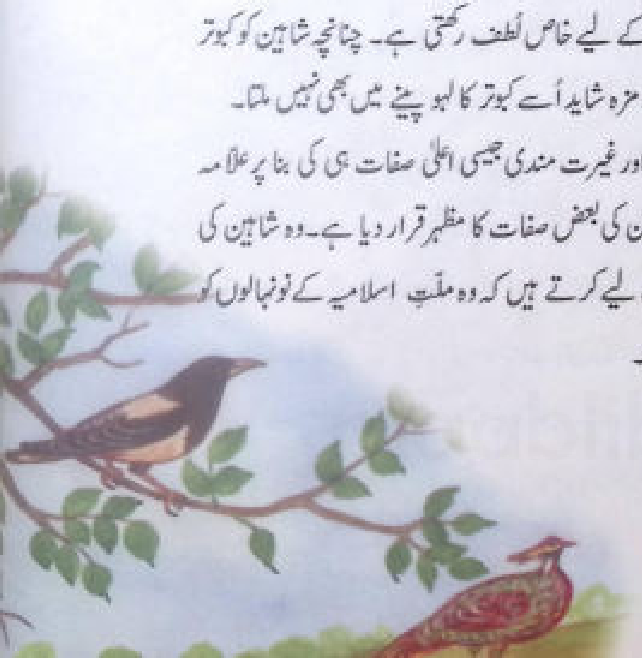
اے میرے بیٹے! میں نے اپنے بزرگوں سے ہمیشہ یہ نصیحت سُنی ہے اور تجھے بھی یہی نصیحت کرتا ہُوں کہ تُو کبھی کسی درخت پر اپنا آشیانہ مت بنانا۔ ہم بازوں کے رہنے کی جگہ باغ اور کھیت نہیں بلکہ ہمارے نشیمن تو پہاڑ اور صحرا ہیں۔ یہ پہاڑ اور صحرا ہمارے لیے بہشت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یاد رکھ کہ زمین پر گرا پڑا دانہ کھانا ایک باز کو کسی حالت میں بھی زیب نہیں دیتا۔ ہمیں تو ہمارے خدا نے رزق کے لیے فضائے آسمانی کی ساری وسعتیں بخش رکھی ہیں۔ جو باز زمین پر چلنے پھرنے کا شیوہ اختیار کرلیتا ہے وہ اصیل و نجیب باز ہونے کے باوجود مرغِ سرا سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ بازوں کو تو زمین کی بجائے پتھروں پر چلنا چاہیے۔ تاکہ اُن کے پنجے پتھروں کی رگڑ سے اور تیز ہو جائیں۔

اے میرے بیٹے! یاد رکھ کہ تو صحرا کے زرد چشم شکاری پرندوں کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور اپنی اصل کے لحاظ سے سیمرغ کی طرح اصیل و نجیب ہے۔ تو وہ جوانِ اصیل ہے کہ مقابلے کے وقت اپنے ناخن سے چیتے کی آنکھیں باہر نکال سکتا ہے۔ تیری پرواز میں فرشتوں کی سی شان پائی جاتی ہے اور تیری رگوں میں کافوری بازوں کا خون دوڑ رہا ہے۔ پس جب تک تیرے دم میں دم ہے، اور جب تک تو اس بُوڑھے آسمان کے نیچے محوِ پرواز ہے تب تک تُجھے اپنی غذا اپنے مارے ہوئے شکار سے حاصل کرنی چاہیے۔ خواہ وہ شکار تجھے آسانی سے حاصل ہو جائے یا اس کے لیے تجھے محنت اور مشقت کی سختی برداشت کرنی پڑے۔ لیکن کبھی اور کسی صورت بھی تُجھے دوسرے کا مارا ہوا شکار نہیں کھانا چاہیے۔ ایک باز کی غیرت تو اس کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ وہ کسی دوسرے باز کے مارے ہوئے شکار سے اپنا پیٹ بھرے۔"

علامہ اقبالؒ نے اس نظم میں باز کی اپنے بچے کو نصیحت کے پیرائے میں وہ تمام اوصاف ایک ایک کرکے گنا دیے ہیں جن کی بنا پر باز اور شاہین کو ان کے محبوب پرندوں اور پسندیدہ

ترین علامتوں کی حیثیت حاصل ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے کلام میں شاہین کے ان اوصاف کا جگہ جگہ ذکر کیا ہے۔ اُن کے بقول اس پرندے میں اسلامی فقر کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ وہ خود دار اور غیرت مند ہے کہ کسی اور کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا۔ وہ بے تعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا۔ وہ بلند پرواز، خلوت پسند اور تیز نگاہ ہے۔ وہ شاہین کو پرندوں کی دُنیا کا درویش قرار دیتے ہیں۔ اس نظم میں باز نے اپنے بچے کو جو نصیحتیں کی ہیں وہ تمام کی تمام ”شاہین“ (بال جبریل) میں شاہین کی اپنی زبان سے بیان ہوئی ہیں۔ پھر جس طرح اس نظم میں باز اپنے بچے کو نصیحت کرتے ہوئے اُسے باز کی نمایاں صفات سے آگاہ کرتا ہے، اس طرح ”نصیحت“ (بالِ جبریل) میں ایک بوڑھا عقاب ایک شاہین بچے کو بتاتا ہے کہ زندگی محنت و مشقت سے عبارت ہے اور شباب اپنے ہی لہو کی آگ میں جلنے کا دوسرا نام ہے۔ جب کوئی ہمہ وقت محنت و مشقت میں مصروف رہے۔ سخت کوشی اس کی زندگی اور جدوجہد اس کی زندگی کا شعار بن جائے تو زندگی کی کڑواہٹ اس کے لیے شہد بن جاتی ہیں۔ ایسے عالم میں اُس کی سخت کوشی اور جدوجہد ہی اُس کے لیے خاص لطف رکھتی ہے۔ چنانچہ شاہین کو کبوتر پر جھپٹنے اور حملہ کرنے میں جو مزہ ملتا ہے وہ مزہ شاید اُسے کبوتر کا لہو پینے میں بھی نہیں ملتا۔

سخت کوشی، بلند پروازی، خودداری اور غیرت مندی جیسی اعلیٰ صفات ہی کی بنا پر علامہ اقبالؒ نے اپنے کلام میں شاہین کو مردِ مومن کی بعض صفات کا مظہر قرار دیا ہے۔ وہ شاہین کی ان صفات کا اپنے کلام میں بار بار ذکر اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ملتِ اسلامیہ کے نونہالوں کو شاہین کی صفات کا حامل دیکھنا چاہتے ہیں۔



اگر خواہی حیات اندر خطر زی

درکار ہے حیات تو خطروں میں زیست کر

ایک ہرن نے دوسرے ہرن کے سامنے اپنا دردِ دل بیان کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے تو اب یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ یہاں سے جا کر حرم کعبہ میں پناہ گزیں ہو جاؤں۔ حرمِ کعبہ اللہ کا گھر ہے اور وہاں ہر ایک کے لیے امان ہے۔ حرم کی حدود میں کسی جانور کا شکار کرنا منع ہے۔ اس حدود میں کسی کا خون بہانے کی بھی اجازت نہیں۔ اس لیے حرمِ کعبہ میں جاکر رہوں گا تو ہر طرح کے خطروں سے محفوظ ہو جاؤں گا۔ یہاں صحرا میں تو میرے لیے زندگی بہت دشوار ہوگئی ہے۔ ہر وقت شکاری گھات میں لگے رہتے ہیں۔ موت کا خطرہ ہر وقت سر پر منڈلاتا رہتا ہے۔ نہ صبح چین نہ شام آرام، نہ دن اطمینان اور نہ رات امان۔ میں تو چاہتا ہوں کہ کسی طرح مجھے صیاد کے فتنے سے امان مل جائے اور میرا دل تمام فکروں اور اندیشوں سے آزاد ہو جائے"۔

ہرن کی باتیں سُن کر اس کے ساتھی ہرن نے جواب دیا۔

"اے یارِ خردمند! اگر تو دُنیا میں زندہ رہنے کا آرزومند ہے تو خطروں، مصیبتوں اور آفتوں میں زندگی بسر کر۔ زندگی کا مزہ اس بات میں نہیں ہے کہ تیری جان ہر قسم کی فکر، ہر طرح کے اندیشے اور ہر نوع کی تکلیف و مصیبت سے آزاد ہو جائے بلکہ زندگی کا لطف تو اس بات میں ہے کہ تو اپنی جان کو پیش آنے والی تمام مشکلات کا مقابلہ کرے۔ تمام مصیبتوں کو



حوصلے سے برداشت کرے اور تمام آفتوں کا دلیری سے سامنا کرے۔ اطمینان کی بات یہ نہیں ہے کہ تجھے صیاد کے فتنے سے امان مل جائے بلکہ اطمینان کی بات ہے کہ تو اپنے آپ کو ہر مشکل، ہر مصیبت اور ہر آفت کا مقابلہ کرنے کے لیے آمادہ و مستعد پائے۔ میرے دوست! تجھے جان لینا چاہیے کہ خطرات اور مشکلات کا مقابلہ کرنے سے ہی خودی میں تیزی پیدا ہوتی ہے جو سان پر چڑھی ہوئی تیز دھار تلوار سے بھی تیز تر ہوتی ہے۔

پس اے میرے دوست! تو خطرات اور مشکلات سے گھبرا کر حرمِ کعبہ میں امان ڈھونڈنے کی بجائے ہر لحظہ اور ہر گھڑی ان خطرات و مشکلات کا مقابلہ کر۔ تو خطرات اور مشکلات ہی سے اپنی طاقت اور ہمت کا امتحان کرسکتا ہے۔ خطرات اور مشکلات تیرے وجود کے اندر مخفی طاقتوں اور صلاحیتوں کے لیے کسوٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کسوٹی کے ذریعے ہی کھوٹے اور کھرے کا پتا چلتا ہے۔ اس لیے جب تک تو مشکلات اور خطرات کا مقابلہ نہ کرلے، اس وقت تک تجھے زندگی کا حقیقی مزہ نہیں مل سکتا۔ خطرات اور مشکلات کا مقابلہ ہی تجھے جینا سکھاتا ہے اور خطرات و مشکلات کا مقابلہ ہی تیرے جسم و جان کے کھوٹے کو کھرا بناتا ہے۔"

علامہ اقبالؒ نے اس نظم میں دو ہرنوں کی گفتگو کے ذریعے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ مشکلات اور خطرات کا مقابلہ کرنے سے ہی انسان کی خودی مضبوط و مستحکم ہوسکتی ہے۔ جو شخص آرام کی زندگی بسر کرتا ہے یا گوشۂ عافیت کا طلب گار رہتا ہے، وہ نہ تو مشکلات و خطرات کا مقابلہ کرسکتا ہے اور نہ کسی مہم کو سر کرنا اس کے بس میں رہتا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے ہرن کے پیرائے میں دراصل ملّتِ اسلامیہ کے نونہالوں سے خطاب کیا ہے اور مسلمان نوجوانوں کو یہ بات سمجھائی ہے کہ مقابلے اور جدوجہد ہی کے ذریعے تیری

خودی کی نشوونما ہوسکتی ہے۔ اگر تو خطرات اور مشکلات سے گھبرا کر گوشۂ عافیت کی تلاش کرے گا تو زندگی کے صحیح لطف سے محروم ہوجائے گا۔ تجھے خطرات اور مشکلات سے گھبرانا اور ڈرنا نہیں چاہیے بلکہ مردانہ وار ان کا مقابلہ کرنا چاہیے کیونکہ یہ خطرات و مشکلات ایک تو تیری طاقت و ہمت کا امتحان ہیں، دوسرے تیری صلاحیتوں کو پروان چڑھانے اور تیری خودی کی نشوونما کا سامان ہیں۔ انھی کی بدولت جینے کا قرینہ آتا ہے اور انھی کی کسوٹی پر زندگی کے کھرے کھوٹے کی پہچان ہوتی ہے۔





اَلْمُلْكُ لِلّٰهِ

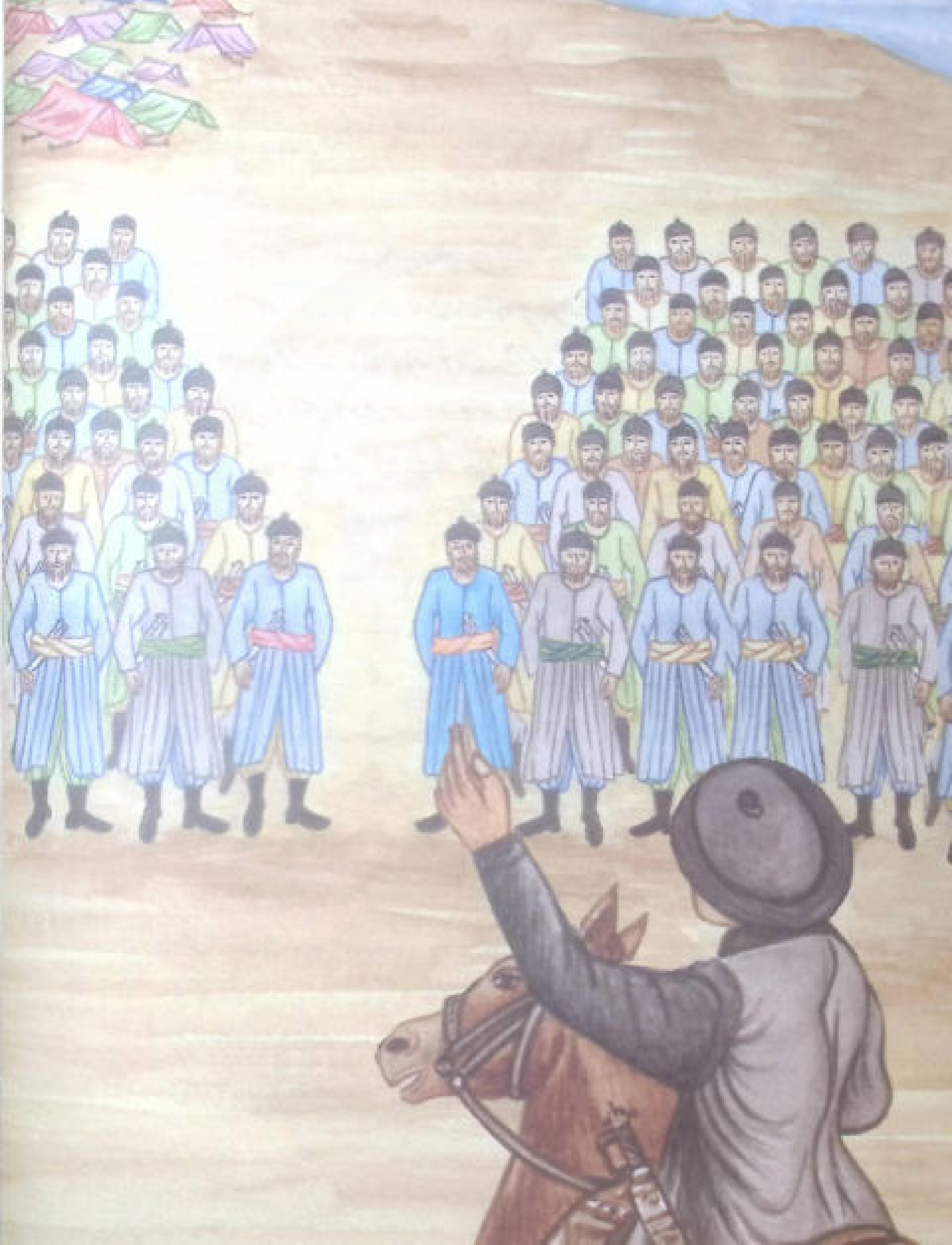
مشہور اسلامی سپہ سالار طارق بن زیاد جب اپنے مجاہدین کے ساتھ شمالی افریقہ سے روانہ ہو کر اندلس کے ساحل پر اترا تو اس نے حکم دیا کہ تمام جہازوں کو آگ لگا دی جائے تاکہ کسی مجاہد کو واپسی کا خیال تک نہ رہے اور وہ جرأت و شجاعت اور دلیری و عزیمت کے پیکر بن کر سرزمینِ ہسپانیہ میں اپنے لیے جگہ پیدا کریں۔

جب طارق نے جہاز جلانے کا حکم دیا تو اس کے ساتھیوں میں سے بعض نے کہا۔

"اے طارق! تو اگرچہ ہمارا امیرِ لشکر ہے اور تیرے حکم پر ہم کافروں کی بھاری سے بھاری جمعیت کا مقابلہ کرنے میں بھی پس و پیش نہیں کریں گے مگر تُو نے جہاز جلانے کا جو حکم دیا ہے وہ ہمیں اچھا نہیں لگا۔ تیرا یہ حکم عقل و خرد کے تقاضوں کے یکسر خلاف ہے۔ ہم اپنے وطن سے سیکڑوں ہزاروں میل دُور پڑے ہیں۔ اگر کسی وجہ سے ہمیں وطن واپس جانا پڑا تو اس کی کیا صورت ہوگی؟ ہماری شریعت نے بھی ترکِ اسباب کا حکم نہیں دیا۔ یہ دُنیا تو عالمِ اسباب ہے۔ یہاں سے واپس جانے کے لیے جہاز کا ہونا لازمی ہے۔ تُو نے جہاز جلانے کا حکم دے کر گویا اسباب کو ترک کر دیا ہے۔ یہ بات کسی لحاظ سے بھی روا نہیں اور نہ اسے دانش مندی ہی کہا جا سکتا ہے۔"

طارق بن زیاد نے اپنے ساتھیوں کی بات سنی تو وہ ہنسا اور اپنی تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا۔

"ہر ملک ہمارا ملک ہے کہ، ہمارے خدا کا ملک ہے"



علامہ اقبالؒ نے اس مختصر نظم میں تاریخِ اسلامیہ کے ایک مشہور واقعے کو نظم کیا ہے جو فاتحِ اندلس طارق بن زیاد کے ساتھ اُس وقت پیش آیا تھا جب وہ اندلس کی فتح کے ارادے سے عرب اور بربر مجاہدین کی جمعیت کے ساتھ ساحلِ اندلس پر پہنچا تھا۔ اُسے رجب ۹۲ ہجری (اپریل ۷۱۱ء) میں خلیفہ ولید بن عبدالملک کے عہد میں شمالی افریقہ کے والی موسیٰ بن نُصیر کی طرف سے سات ہزار مجاہدوں کے ساتھ ہسپانیہ پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ یہ کارروائی ہسپانیہ کے لوگوں کی درخواست پر عمل میں آئی تھی جن کی ایک جماعت موسیٰ بن نُصیر کے پاس راڈرک شاہِ ہسپانیہ کے ظلم وستم کی فریاد لے کر آئی تھی۔

طارق بن زیاد شمالی افریقہ کے بربری قبائل کی نسل سے تھا۔ جب بربر قوم نے اسلام قبول کیا اور طارق کے والد مسلمان ہوئے تو انھوں نے دمشق میں سکونت اختیار کرلی۔ اُموی سلطنت کے مشہور سپہ سالار نے طارق کو اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ طارق سولہ برس کا تھا جب فوج میں بھرتی ہوا اور اپنی خداداد صلاحیتوں کی بدولت جلد ہی ایک دستے کا سالار بن گیا۔ موسیٰ بن نُصیر خلیفہ ولید کے عہد میں مغرب اقصیٰ (شمالی ومغربی افریقہ) کا گورنر مقرر ہوا۔ جب اندلس سے ایک جماعت اس کے پاس راڈرک شاہِ ہسپانیہ کے ظلم وستم کی فریاد لے کر آئی تو موسیٰ بن نصیر نے ایک چھوٹی سی جماعت ہسپانیہ بھیج دی جو ساحلی جزیروں پر یورش کے بعد لوٹ آئی۔ پھر ہسپانیہ پر باقاعدہ حملے کا فیصلہ کیا گیا اور طارق بن زیاد ہسپانیہ پر حملہ کرنے والی فوج کا سالارِ اعظم مقرر ہوا۔

طارق بن زیاد اپنے ساتھ صرف سات ہزار مجاہد لے کر گیا تھا اور اُس مقام پر اُترا تھا جو اب تک جبل الطارق (جبرالٹر) کی شکل میں اس کی یاد تازہ کر رہا ہے۔ ابتدا میں معمولی جھڑپیں ہوئیں۔ پھر شاہ راڈرک تقریباً ایک لاکھ فوج کے ساتھ مقابلے پر آیا۔ جھیل لاجنڈا کے

کنارے طارق بن زیاد اور شاہ راڈرک کے درمیان فیصلہ کن جنگ ہوئی جو تین روز جاری رہی۔ طارق کے جانباز غریب الوطن تھے اور اجنبی ملک میں لڑ رہے تھے۔ راڈرک اپنے ملک میں تھا اور تمام ملکی وسائل اس کے قبضے میں تھے۔ اس کے باوجود اس نے شکست کھائی۔ وہ میدانِ جنگ سے بھاگ نکلا لیکن دریا میں ڈوب کر مر گیا۔

طارق بن زیاد کے پاس چار جہاز تھے جنھوں نے کئی چکروں میں اسلامی فوج کو افریقہ سے ہسپانیہ پہنچایا۔ آخری چکر میں خود طارق گیا۔ جب اس کے تمام مجاہد اندلس کے ساحل پر پہنچ گئے تو اُس نے جہاز جلانے کا حکم دے دیا۔ اُس کا مقصد یہ تھا کہ کسی مجاہد کے دل میں واپسی کا خیال تک نہ رہے اور وہ یہ سوچ کر میدانِ جنگ میں دشمن کے مقابل جائے کہ اُسے شکست ہو یا فتح، وہ شہید ہو یا غازی، اب اسے بہرحال اس سرزمین پر اپنے لیے جگہ بنانی ہے۔ چاہے وہ جگہ قبر کی دو گز زمین ہو یا قصرِ شاہی کے وسیع و عریض ایوانوں کی آراستہ پیراستہ آرام گاہیں ہوں۔

جب طارق بن زیاد نے جہاز جلانے کا حکم دیا تو اُس کے بعض ساتھیوں نے اعتراض کیا کہ یہ حکم دانش مندی کے تقاضوں کے خلاف ہے۔ ہم ایک اجنبی ملک میں لڑنے آئے ہیں۔ کل کو یہاں سے واپس جانے کی ضرورت پیش آئی تو ہماری واپسی کس طرح ممکن ہوگی؟ اسلام تو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ مادی اسباب اور وسائل کو ترک کر دیا جائے۔

اپنے ساتھیوں کے اعتراض سُن کر طارق بن زیاد ہنسا اور اُس نے اپنی تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا کہ ہر ملک ہمارا ملک ہے کیوں کہ ہمارے خدا کا ملک ہے۔

ان الفاظ سے طارق بن زیاد کا مقصود اپنے ساتھیوں کے ذہنوں میں یہ بات بٹھانا تھا کہ ہم کسی مُلک کو اجنبی ملک نہیں سمجھتے اور نہ کوئی ملک ہمارے لیے اجنبی ملک ہو سکتا ہے۔ ہر

مُلک ہمارا اپنا مُلک اور ہماری جاگیر ہے کیوں کہ وہ ہمارے خدا کا ملک اور ہمارے خُدا کی جاگیر ہے۔ طارق بن زیاد اپنے مجاہد ساتھیوں کو یہ بھی بتانا چاہتا تھا کہ ہم یہاں سے واپس جانے کے لیے نہیں آئے بلکہ اسی سرزمین پر اپنا مقام بنانے آئے ہیں اور جہازوں کو جلا دینے کی مصلحت بھی یہی ہے کہ کسی مجاہد کے دل میں واپسی کا خیال بھی نہ رہے اور وہ لڑے تو اسی خیال کے تحت لڑے کہ ہار ہو یا جیت، دونوں صورتوں میں اس کا مقام ہسپانیہ ہی کی سرزمین ہے۔

علامہ اقبال نے طارق بن زیاد کے ساحلِ اندلس پر جہاز جلا دینے کے واقعے کو اپنے مخصوص اور دلکش انداز میں قلم بند تو کیا ہی ہے لیکن انھوں نے ''طارق کی دعا'' (بالِ جبریل) کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے وہ ایک لحاظ سے اس نظم کے تکملہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ راڈرک شاہِ ہسپانیہ کے خلاف جنگ کے آغاز سے قبل طارق بن زیاد نے مجاہدین کے سامنے ایک پُرجوش تقریر کی اور پھر اللہ تعالیٰ سے فتح و کامرانی کے لیے دعا مانگی۔ علامہ اقبالؒ نے طارق کے حملے کے مقصد، اس کے کردار اور دیگر عوامل کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس دعا کا تصور کیا اور اسے اشعار کا جامہ پہنا دیا۔

علامہ اقبالؒ طارق بن زیاد کی زبان سے یہ کہلواتے ہیں کہ اے خُدا! تیرے نام پر لڑنے والے یہ مجاہد بندے دُنیا کی نظروں میں نہایت پُر اسرار ہیں۔ یہ دُنیا میں تیری رضا پوری کرنے کے لیے سرگرمِ عمل ہیں۔ یہ ایسے جذبے سے سرشار ہیں کہ صحرا اور پہاڑ، دریا اور سمندر بھی ان کا راستہ نہیں روک سکتے۔ صحرا اور دریا ان کی ٹھوکروں سے دو ٹکڑے ہو جاتے ہیں اور پہاڑ ان کے رُعب و دبدبے سے سمٹ کر رائی بن جاتے ہیں۔ یہ غازی تیرے عشق میں اس حد تک سرشار ہیں کہ ان کے دل تیری محبت کے سوا ہر چیز سے بیگانہ ہیں۔ یہ نہ مالِ

غنیمت چاہتے ہیں اور نہ انھیں ملک فتح کرنے کی آرزو ہے۔ یہ طلب گار ہیں تو صرف شہادت کے طلب گار ہیں کہ تیرے نام پر لڑتے لڑتے جان دے دیں۔ یورپ کی سرزمین کب سے ان کی راہ دیکھ رہی ہے کہ کب یہ مجاہد آئیں اور اپنے عربی خون کا نذرانہ دے کر اس سرزمین پر توحید کا پرچم بلند کریں۔

علامہ اقبالؒ طارق بن زیاد کی زبان سے مزید کہلواتے ہیں کہ اے اللہ! یہ تیرا کرم تھا کہ تُو نے ان صحرا کی گود میں پرورش پانے والوں کو علوم وفنون، قوت ایمانی اور ذوق عبادت کے لحاظ سے بے نظیر بنادیا۔ زندگی کو جس سوز کی صدیوں سے آرزو اور طلب تھی وہ سوز اُسے انھی مجاہدین کے جگر میں ملا ہے۔ دُنیا کو زندگی کا صحیح قرینہ سکھانے والے یہی مجاہد ہیں۔ یہ وہ مجاہد ہیں جو موت کو موت نہیں سمجھتے بلکہ دل کا دروازہ کھلنے اور دل کی مراد برآنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اے باری تعالیٰ! تُو اپنی رحمت سے مردِ مومن کے دل میں پھر اسی بجلی کو زندہ کر دے جو حضرت نوح علیہ السلام کے نعرۂ لَا تَذَرْ میں تھی۔ تاکہ کفر کی ساری قوتیں جل کر راکھ ہو جائیں اور دُنیا میں خدا کا کوئی ایک منکر بھی نہ رہے۔ اے خُدا! ان مجاہدوں کے سینوں میں جو عزم، ولولے اور حوصلے محوِ خواب ہیں، انھیں بیدار کردے اور ان کی نگاہوں میں تلوار کی تیزی پیدا کردے تاکہ تیرے مجاہد دُنیا میں تیرا بول بالا کرسکیں۔

اس طرح علامہ اقبالؒ کی یہ دونوں نظمیں الملک للہ اور طارق کی دعا مل کر طارق بن زیاد کے مجاہدانہ افکار وخیالات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ طارق کی دُعا میں تو دُعا اور عسکری جذبہ دونوں کچھ ایسے ہم آہنگ ہوئے ہیں کہ اس نظم کو دعا کے ساتھ ایک مسلمان مجاہد کا ترانہ بھی کہا جاسکتا ہے۔

یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ طارق بن زیاد نے جس تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھ

کر مجاہدین کے دلوں کو گرما دینے والے یہ غیر فانی الفاظ کہے تھے، اندلس کی فتح کے بعد اس تلوار کے لوہے کو پگھلایا گیا اور اس میں فولاد کی کثیر مقدار شامل کر کے اس مرکب سے بہت سی تلواریں بنائی گئیں۔ مراکش سے لے کر ہندوستان تک ہر ملک میں اہلِ اسلام کے اسلحہ خانے کو ان میں سے ایک ایک تلوار بھجوا دی گئی تھی۔

ان تلواروں میں سے جو تلوار ہندوستان بھیجی گئی تھی وہ شہنشاہ عالمگیرؒ کی وفات کے بعد سلطان فتح علی خان ٹیپو کے قبضے میں آئی۔ سلطان ٹیپو ہر جنگ میں طارق بن زیاد کی دی ہوئی اسی تلوار سے دادِ شجاعت دیتا رہا۔ ۱۷۹۹ء میں سلطان ٹیپو کی شہادت کے بعد جب قلعہ سرنگاپٹم پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا اور سلطان کی نعش کی تلاش شروع ہوئی تو پورے پانچ گھنٹوں کی تلاش و جستجو کے بعد رات کے نو بجے سلطان شہید کی نعش بڑے پھاٹک میں نعشوں کے انبار کے نیچے سے نکالی گئی۔ سلطان کے ہاتھ سے سب کچھ جا چکا تھا۔ دولت، ثروت، حکومت، سلطنت، جانِ عزیز...... لیکن طارق بن زیاد کی دی ہوئی تلوار بہ دستور اس کے ہاتھ میں موجود تھی۔ سلطان کی انگلیاں اس تلوار کے قبضے میں اس طرح پیوست ہوگئی تھیں کہ بمشکل تمام وہ تلوار سلطان شہید کے ہاتھ سے الگ کی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ انگریزوں نے وہ تلوار سلطان ٹیپو شہید کے ہاتھ سے لے کر کسی غار میں چھپا دی تھی جس کے بعد سے اس تلوار کا کچھ پتا نہیں چلا۔



نامہ عالمگیرؒ

اپنے فرزندوں میں سے ایک کے نام جو باپ کے مرنے کی دُعا کرتا تھا

اے فرزندِ من! اُس خدا نے جو ازلی و ابدی خُدا ہے، یہ دنیا اور اس میں ہونے والے انقلابات بہت دیکھے ہیں۔ اُس نے اس خطۂ ارض میں رہنے والے درد وغم سے چُور انسانوں کے چاک سینوں سے بلند ہونے والے سیکڑوں ہزاروں درد ناک نالے سُنے ہیں۔ اس کی نگاہوں کے سامنے ایک دو نہیں، ہزاروں انسان حضرت امام حسینؓ کی طرح خاک و خون میں تڑپ چکے ہیں لیکن اس نے کسی کی موت پر افسوس اور تاسف کا اظہار نہیں کیا۔ کسی کی دردناک سے درد ناک موت پر بھی اُس کے سینے سے کبھی کوئی آہ بلند نہیں ہوئی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے عزیز بیٹے حضرت یوسف علیہ السلام کی جدائی میں چالیس برس تک اتنا روتے رہے کہ روتے روتے ان کی آنکھوں کی بینائی جاتی رہی۔ لیکن کنعان کی سرزمین کے اس بُوڑھے کی آہ و زاری پر اس خدا کا دل بالکل نہیں پسیجا۔ حضرت ایوب علیہ السلام نے دورِ ابتلا و آزمائش میں سیکڑوں تکلیفیں اٹھائیں، لیکن اُن کی آہ و فریاد نے خدا کے دل پر کوئی اثر نہیں کیا۔

"اے نادان! کیا تُو یہ سمجھتا ہے کہ وہ ازلی و ابدی خُدا جس کے لیے دُنیا والوں کی بڑی سے بڑی مصیبت کوئی معنی نہیں رکھتی، تیری دُعا کے دام میں آجائے گا اور تیری دُعا قبول کرلے گا؟ کیا تو یہ سمجھ بیٹھا ہے کہ وہ اپنی مشیئت اور منشا کے خلاف محض تیری آرزو پُوری کرنے کے لیے مجھے قبل از وقت موت دے دے گا؟ ارے نادان! تو لاکھ میرے مرنے کی دُعائیں کر لیکن تیری یہ سب دُعائیں بے سُود ہیں۔ مجھے موت تیری دُعا اور مرضی سے تو کیا



میری اپنی دُعا اور مرضی سے بھی نہیں آسکتی۔ مجھے موت اُسی وقت آئے گی جب خدا کا حکم ہوگا۔ میں اُسی وقت مروں گا جب میرے خدا کی مرضی ہوگی۔

علامہ اقبالؒ نے اس نظم میں شہنشاہ ہند محی الدین اورنگ زیب عالمگیرؒ کے ایک خط کا مضمون منظوم کیا ہے جو اُنھوں نے اپنے ایک بیٹے کے نام تحریر کیا تھا۔ عالمگیرؒ بادشاہ نے اپنی شہزادگی اور پھر بادشاہت کے دوران میں جو خطوط سپردِ قلم کیے تھے۔ وہ بیش بہا معلومات کا ذخیرہ ہونے کے علاوہ ادب اور انشا کا بھی قابلِ قدر نمونہ ہیں اور ایک عرصہ تک ان خطوط کو جو" رُقعاتِ عالمگیری" کے نام سے معروف ہیں، مدارس میں سبقاً سبقاً پڑھایا جاتا رہا ہے۔

شہنشاہ عالمگیر کا دوسرا بیٹا ابوالمعظم شمس الدین محمد جو اورنگ زیب کی وفات کے بعد بہادر شاہ اوّل کے لقب سے ۱۷۰۷ء میں تختِ نشین ہوا۔ اپنے باپ کی درازیٔ عمر سے تنگ آگیا تھا۔ اس نے ایک نجی محفل میں یہ بات کہی کہ "تخت و تاج کے انتظار میں بال سفید ہوگئے لیکن بڈھے کو موت ہی نہیں آتی۔ خدا کرے وہ جلد اس دُنیا سے رخصت ہو تا کہ میری دلی آرزو برآئے۔ اس وقت اس کی عمر پچپن سال سے زیادہ ہو چکی تھی۔ جب اس بات کی اطلاع شہنشاہ عالمگیرؒ کو ہوئی تو اُس نے اپنے اس فرزند کے نام ایک خط تحریر کیا جو رُقعاتِ عالمگیری میں موجود ہے۔ اسی خط کے مضمون کو علامہ اقبالؒ نے اس نظم کے اشعار کی صورت دے دی ہے۔

شہنشاہ عالمگیر کے خط کے پیرائے میں علامہ اقبالؒ نے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ اس دنیا میں قضا و قدر کے فیصلے نہ کسی مرد کی دعاؤں اور التجاؤں سے متاثر ہوتے ہیں اور نہ کسی کی آہ و فغاں یا گریہ وزاری ان فیصلوں کو تبدیل کرسکتی ہے۔ نہ پیرِ کنعان کے آنسو ان فیصلوں کی سیاہی کو دھو سکتے ہیں اور نہ شہیدِ کربلا کی مظلومیت کا نقش ان میں کوئی نرمی پیدا کرسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنی مشیت کے مطابق جس کو جتنی زندگی چاہتا ہے عطا فرماتا ہے اور جس کو جیسے حال میں جب تک چاہتا ہے رکھتا ہے۔ اس کی مشیت کے سامنے کسی بڑی سے بڑی ہستی کو بھی دم مارنے کی مجال نہیں۔



حکایاتِ اسرار و رموز



طائرِ تشنہ

کہتے ہیں کہ ایک پرندہ پیاس سے بے حال و بے قرار ہو رہا تھا۔ پیاس کی شدت نے اس کے سینے میں آگ لگا رکھی تھی اور اس کیفیت کی وجہ سے اُسے اپنا سانس دھوئیں کی لہر کی طرح معلوم ہو رہا تھا اور اُسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

پرندہ پانی کی تلاش و جستجو میں بے قرار ہو رہا تھا کہ دُور باغ کے ایک کونے میں اُسے الماس کا ایک ریزہ دکھائی دیا۔ پیاس کی شدت نے پرندے پر کچھ ایسی کیفیت طاری کر رکھی تھی کہ الماس کا وہ ریزہ اُسے پانی کا قطرہ نظر آیا۔ ویسے بھی الماس کا وہ ریزہ سورج کی کرنوں سے جگمگا رہا تھا۔ دُور سے جو کوئی بھی اُسے دیکھتا پانی کا قطرہ ہی سمجھتا اور پرندہ تو پیاس کی شدت سے بے حال تھا۔ اُسے اس پر پانی کے قطرے کا گمان کیسے نہ ہوتا۔

پرندہ جھٹ اُڑا اور وہاں پہنچتے ہی اپنی چونچ الماس کے ریزے پر ماری لیکن وہ تر نہ ہوئی۔ ظاہر ہے کہ وہ الماس سے نمی کیسے حاصل کر سکتا تھا۔ پرندہ کی یہ نادانی دیکھ کر الماس نے اس سے کہا۔

''اے طائرِ نادان! تو نے مجھے اپنی ہوس کا شکار کرنا چاہا مگر یہ نہ جانا کہ میں کون ہوں؟ کیا ہوں؟ ارے نادان! میں پانی کا قطرہ نہیں کہ کوئی گھونٹ بھر لے۔ دوسروں کے حلق تر کرنا میرا کام نہیں۔ میں اس لیے زندہ نہیں ہوں کہ دوسرے مجھے ہڑپ کر جائیں۔

''ارے نادان! تُو مجھے دُکھ دینے کا قصد کرتا ہے؟ کیا تُو پاگل ہے؟ کیا تجھے معلوم نہیں کہ اپنے آپ کو نمایاں کرنے والی زندگی کیسی ہوتی ہے؟ مجھ میں جو چمک دمک اور آب و تاب



ہے شاید اسے دیکھ کر تو دھوکا کھا گیا۔ ارے نادان! میری آب تو پرندوں کی چونچیں توڑ کر رکھ دیتی ہے اور اگر کوئی قسمت کا مارا انسان مجھے نگل جائے تو اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ نادان پرندے! تیری نظر کو دھوکا ہوا ہے۔ میں نہ قطرۂ آب ہوں اور نہ ساقی۔ میں تو دوسروں کے لیے جینے کی منزل سے کبھی کا گزر چکا ہوں۔"

پرندے کو سخت مایوسی اور شرمندگی ہوئی۔ الماس سے اُس کا دلی مقصد حاصل نہ ہُوا۔ اِدھر پیاس سے اُس کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ اُس نے الماس کے چمکتے ہوئے ریزے سے مُنہ پھیر لیا اور پھر اِدھر اُدھر دیکھا کہ شاید چمن میں کہیں اُسے اپنی پیاس بجھانے کا سامان مل جائے۔

اچانک اُس نے دیکھا کہ پھول کی ایک شاخ پر شبنم کا ایک قطرہ بُلبل کی آنکھ سے ٹپکے ہوئے آنسو کی طرح چمک رہا ہے۔ اُس کی چمک دمک سورج کی کرنوں کے باعث تھی۔ وہ سورج کا شکریہ بھی ادا کر رہا تھا اور ساتھ ہی سُورج کے خوف سے اُس کا بدن کانپ رہا تھا۔

یوں لگتا تھا جیسے وہ آسمان کا ایک تارا ہے جس کی فطرت ہی نقل و حرکت ہے اور وہ اپنے ذوقِ نمود کی خاطر دم بھر کے لیے پھول کی شاخ پر ٹھہر گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُس نے پھولوں اور کلیوں سے سیکڑوں فریب کھائے ہیں مگر ابھی تک زندگی سے اُسے کوئی حصہ نہیں ملا۔ پیاس کی شدت سے بے تاب پرندہ اُڑا اور پھول کی شاخ کے نیچے پہنچ گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ قطرۂ شبنم اس کے حلق سے نیچے اتر چکا تھا۔

علامہ اقبالؒ نے پیاسے پرندے کی اس حکایت کے ذریعے یہ امر واضح کیا ہے کہ جو چیز اپنی ذات اور وجود میں محکم نہیں ہوتی وہ دوسروں کی ہوس اور ضرورت کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے مگر جس کا وجود محکم ہوتا ہے، دوسرے خواہش اور کوشش کے باوجود اُسے اپنی ہوس کی تسکین

یا ضرورت پوری کرنے کا ذریعہ نہیں بنا سکتے۔

پرندہ تو پیاس کی شدت سے بے تاب و بے قرار تھا۔ اُسے کسی نہ کسی طرح اپنی پیاس بُجھانی تھی اور کسی نہ کسی کی زندگی کو اپنی جان بچانے کا ذریعہ بنانا تھا۔ اُس نے الماس پر چونچ مار کر اپنی پیاس بُجھانا چاہی لیکن الماس اپنی ذات میں محکم تھا اس لیے پرندہ خواہش اور کوشش کے باوجود اُسے کوئی گزند نہ پہنچا سکا۔ اس کے برعکس شبنم کا قطرہ نہ تو جسم کا سخت تھا اور نہ اُس کی فطرت میں الماس کی سی پختگی تھی۔ اس لیے اُس کا وجود پرندے کی ہوس کی نذر ہو گیا اور اُس کی زندگی کو پرندے نے اپنی جان بچانے کا ذریعہ بنایا۔

پس اگر ہمیں اپنی بقا اور سلامتی مطلوب ہے تو ہمیں ایک لمحہ کے لیے بھی اپنی خودی کی حفاظت سے غافل نہیں ہونا چاہیے اور قطرۂ شبنم بن کر نہیں بلکہ ریزۂ الماس کی طرح زندہ رہنا چاہیے۔



حضرت شیخ میاں میرؒ و پادشاہِ ہند

مغلیہ خاندان کا پانچواں فرماں روا شہنشاہ شاہ جہاں اپنی سلطنت کی حدود بڑھانے اور اپنے حلقہ اقتدار و اختیار کو وسیع تر کرنے کی فکر میں لگا رہتا تھا۔ یہ فکر اُسے تسخیرِ ممالک کی حرص میں لگائے رکھتی تھی۔ اس حرص و ہوس نے اُس کے وجود میں ایک آگ دہکا رکھی تھی۔ اس کی تلوار ایک علاقہ فتح کر چکنے کے بعد دوسرے علاقے کا رخ کرتی تھی اور دوسرے علاقے کو فتح کرنے کے بعد اس کا رخ کسی تیسرے علاقے کی طرف ہو جاتا تھا۔

اس وقت دکن میں بڑا ہنگامہ برپا تھا۔ شاہی افواج دکن کی ریاستوں سے نبرد آزما تھیں۔ اور یہ ریاستیں شاہی افواج کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہی تھیں۔ ایسے میں ایک روز شہنشاہ شاہ جہاں اُس عہد کے مشہور خُدا رسیدہ بزرگ حضرت میاں میرؒ کی خدمت میں پہنچا۔ شاہ جہاں خود بھی اُن کا مرید اور عقیدت مند تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ حضرت شیخ میاں میرؒ سے لشکرِ شاہی کی فتح و کامرانی کے لیے دعا کروائے اور اس طرح اپنی تدبیر کو دعا سے تقویت پہنچائے۔ اس لیے کہ مسلمان چاہے کتنا ہی گیا گزرا کیوں نہ ہو وہ محض تدبیر کے بھروسے پر نہیں رہتا بلکہ خُدا سے بھی دُعا کرتا ہے۔ وہ تدبیر میں بھی کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھتا اور دُعا سے بھی غافل نہیں رہتا۔ چنانچہ شاہ جہاں کی حاضری کا مقصد یہی تھا کہ حضرت میاں میرؒ شاہی افواج کی فتح و نُصرت کے لیے دعا فرمائیں۔ حضرت شیخ میاں میرؒ نے دُعا کے لیے بادشاہِ ہند کی درخواست سُنی اور بدستور خاموش بیٹھے رہے۔ اس پر ساری محفل ہمہ تن انتظار بن گئی کہ دیکھیں شہنشاہ ہند کی عرض داشت کے جواب میں درویشِ خدا مست کی طرف سے کیا ارشاد ہوتا ہے۔



اتنے میں حضرت شیخ میاں میرؒ کا ایک عقیدت مند اور مرید حاضرِ خدمت ہوا اور عرض کی۔

"یا حضرت! میں نے بڑی محنت اور مشقت سے یہ ایک درہم کمایا ہے تاکہ اسے آپ کی خدمت میں بطور نذرانہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کرسکوں۔ پیرو مرشد! آپ خدا کی راہ سے بھٹکنے والوں کا ہاتھ تھام لیتے ہیں۔ میری یہ حقیر سی نذر قبول کر کے نیاز مند کی ایک دیرینہ آرزو پوری ہونے کا موقع عنایت فرمائیں۔"

اس پر حضرت میاں میرؒ نے فرمایا۔

"اس سکے پر ہمارے سلطان کا حق ہے کیونکہ اس کے شاہی لباس کے اندر ایک فقیر چھپا ہوا ہے۔ وہ بظاہر ایک وسیع سلطنت کا مالک ہے پھر بھی سب سے زیادہ غریب ہے۔ ہمارا بادشاہ کہنے کو بادشاہ ہے لیکن حقیقت میں مفلس ترین انسان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنی نگاہیں غیروں کے دستر خوان پر جما رکھی ہیں اور اس کے اندر بھوک کی جو آگ بھڑک رہی ہے، اس نے ایک دنیا کو جلا کر خاکستر کر رکھا ہے۔

"ہمارے بادشاہ کی تلوار جدھر چمکتی ہے، اپنے ساتھ قحط اور طاعون جیسی بلاؤں کو لے جاتی ہے۔ اس کی تعمیر نے ایک جہان ویرانہ کر رکھا ہے۔ وہ نادار ہے اور جو کچھ جہاں سے ملے، لے لینا چاہتا ہے۔ اُس کا خالی ہاتھ دولت سمیٹنے کی حرص میں ضعیفوں اور کمزوروں کو دُکھ دے رہا ہے۔

اگرچہ ہمارا بادشاہ بڑی شان وشکوہ اور دبدبے کا مالک ہے لیکن اس کی یہ خصوصیت اہلِ دنیا سے دشمنی کا باعث بن گئی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے نوعِ انسان ایک قافلہ ہے اور ہمارا بادشاہ اس قافلے کے لیے ایک رہزن ہے۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ اس نے لوٹ مار اور

تخت و تاراج کو فتح و تسخیر کا نام دے رکھا ہے۔ شاہی لشکر اور غنیم کی افواج دونوں اس کی حرص کی تلوار کے باعث ٹکڑے ٹکڑے ہو رہی ہیں۔ دونوں طرف کے سپاہی اس کے شوقِ تسخیر کی بھینٹ چڑھتے ہوئے لقمۂ اجل بن رہے ہیں۔

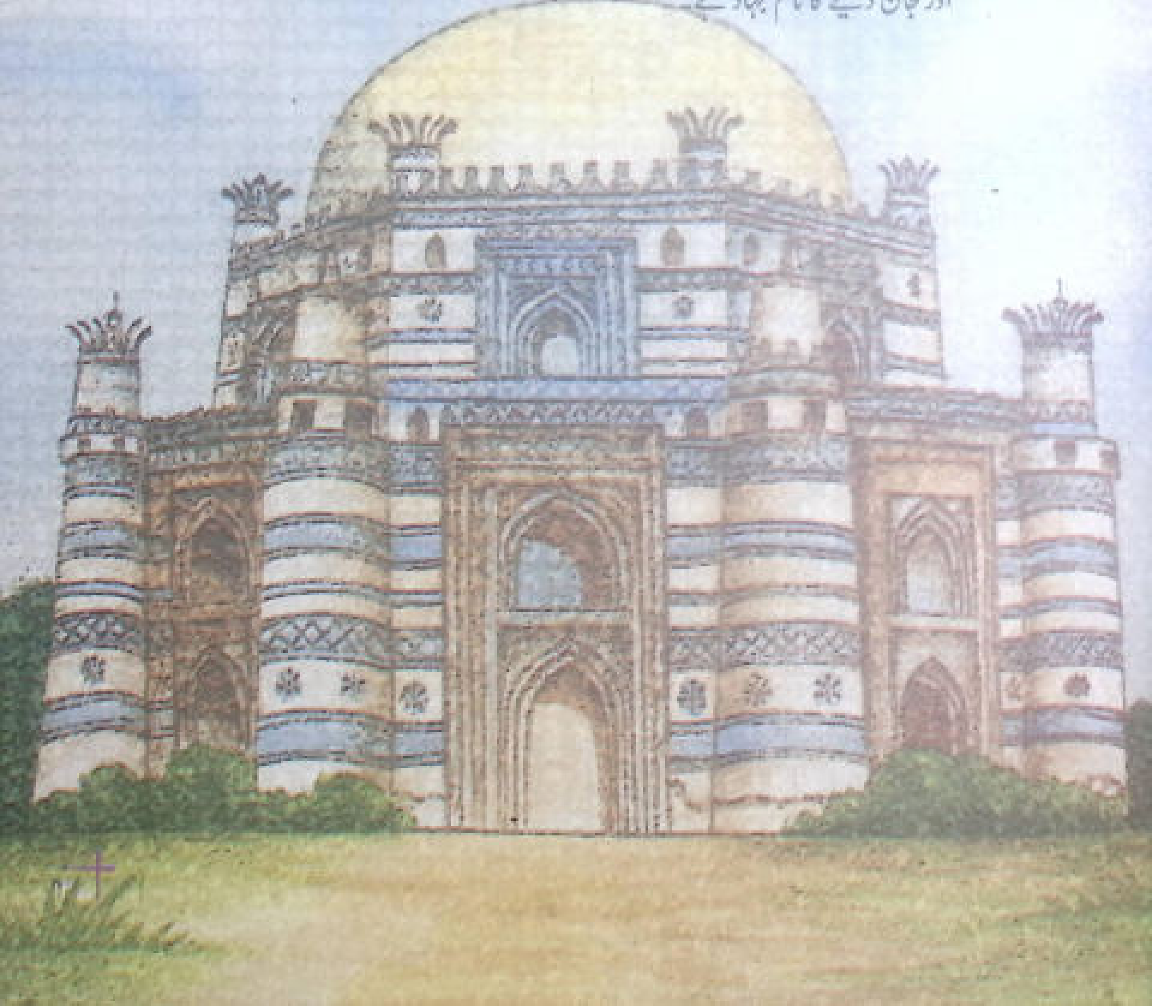
اگر فقیر بھوکا ہو تو اس کی بھوک صرف اس کی جان کے لیے آگ بن کر اسے جلاتی ہے لیکن بادشاہ کی بھوک ملک اور قوم کو فنا کے گھاٹ اُتار دیتی ہے۔ یاد رکھو! جس کسی نے خُدا کے سوا کسی کے لیے تلوار کھینچی، وہ تلوار اسی کے سینے میں اُترے گی۔"

علامہ اقبالؒ نے اس حکایت کے ذریعے اس امر کی توضیح فرمائی ہے کہ مسلمان کی زندگی کا مقصد کلمۂ حق کی سربلندی ہے۔ جہاد اس غرض کے لیے لازم قرار پایا ہے کہ اس کے ذریعے حق کا بول بالا ہو لیکن اگر جہاد کا محرک تسخیرِ ممالک یا ہوسِ ملک گیری ہو تو ایسا جہاد اسلام کی رُو سے حرام ہے۔ مسلمان کی فطرت ہی یہ ہے کہ وہ خدا کے عشق میں ڈوبا رہے۔ اس کا ہر عمل خدا کی رضا کے تابع ہوتا ہے اور اس کے ہر عمل کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ خدا کا قرب حاصل ہو۔ اگر خدا کے سوا کچھ اور مقصود ہوگا تو صُلح بھی جو بظاہر نیک کام ہے۔ سراسر بُرائی بن جائے گی اور اگر خدا کی رضا اور خوشنودی نصب العین ہو تو جنگ بھی جو بظاہر برا کام ہے۔ بلاشبہ نیکی کی شکل اختیار کرلے گی۔ چنانچہ اگر ہماری تلوار سے کلمۂ حق سربلند نہ ہو اور خدا کی رضا کا دائرہ وسعت اختیار نہ کرے تو ایسی تیغ زنی اور جنگ آزمائی قوم کے لیے نامبارک ثابت ہوگی۔ نہ اس سے کوئی فائدہ حاصل ہوگا اور نہ اس سے کوئی عزت ملے گی۔

چنانچہ علامہ اقبال نے حضرت میاں میرؒ کی زبان سے یہ حقیقت بیان فرمائی ہے کہ جنگجو بادشاہ، حاکم یا سُلطان گداگروں سے بھی بدتر ہیں۔ گداگر کی بھوک تو اس کی اپنی جان کو کھاتی ہے مگر بادشاہ، حاکم یا سُلطان کی ہوس ہزاروں لاکھوں بندگانِ خُدا کے لیے موت کا پیغام بن

جاتی ہے۔ لیکن ایسے لوگ قدرت کے قانونِ مکافات سے بچ نہیں سکتے۔ جو شخص بھی حق و انصاف کے بغیر محض ملک گیری کی ہوس میں تلوار اٹھائے گا، اُس کی تلوار خود اُس کے سینے سے پار ہوگی۔

پس حکومت و اقتدار، مال و دولت یا محض قتل و غارت کی خاطر جو لڑائی لڑی جائے گی، وہ جہاد نہیں ہوسکتی۔ فقط خدا اور نیکی کے راستے میں کوشش کرنے اور اس راہ میں جان لڑانے اور جان دینے کا نام جہاد ہے۔





شیر و شہنشاہ عالمگیرؒ

خاندانِ مغلیہ کا چھٹا فرماں روا شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیرؒ، شہنشاہ بابر سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک پورے شاہانِ مغلیہ میں ممتاز و منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ وہ ایسا بادشاہ تھا جو درویش بھی تھا اور صاحبِ شمشیر بھی۔ وہ شمعِ توحید کا پروانہ بھی تھا اور الحاد و بے دینی کے خرمن کو جلا ڈالنے والی بجلی بھی۔ ہندوستان میں ملّتِ اسلامیہ پر فتنوں کے دروازے کھل رہے تھے۔ یہ شہنشاہ عالمگیرؒ کی مساعی کی برکت تھی کہ دین از سرِ نو زندہ ہوا اور دلوں میں یقین و ایمان کی بجھتی ہوئی شمعیں پھر سے روشن ہوگئیں۔

شہنشاہ عالمگیر علاوہ اور اوصاف کے دلیری و بے خوفی میں اپنی مثال آپ تھا۔ کہتے ہیں کہ ایک روز وہ صبح کے وقت ایک جنگل کی سیر کے لیے نکل گیا۔ صرف ایک وفادار غلام اس کے ساتھ تھا۔ صبح کی تازہ اور پاکیزہ ہوا ہر طرف چل رہی تھی اور اس سے مست ہو کر ہر درخت پر طائرانِ خوش نوا تسبیح و تحمید میں لگے ہوئے تھے۔ شہنشاہ عالمگیر نے بھی مصلّا بچھایا اور نماز میں مصروف ہوگیا۔

عین اس حالت میں جنگل سے ایک شیر نکلا اور انسانی بُو پا کر سیدھا اس طرف آیا جہاں شہنشاہ عالمگیرؒ نماز میں مصروف تھا۔ شیر آیا اور اس نے بادشاہ کی کمر پر پنجہ مارا۔ بادشاہ نے آنکھ اٹھائے بغیر خنجر کھینچا اور غضب ناک شیر کا پیٹ چاک کر ڈالا۔ اس پر نہ تو کوئی گھبراہٹ طاری ہوئی اور نہ اس کے دل میں کوئی خوف پیدا ہوا بلکہ اس نے خنجر کے ایک ہی وار میں شیر کو بے جان کر کے زمین پر گرا دیا۔





کے بعد اللہ تعالیٰ کی بارگاہ

ہو گیا تھا کہ اپنی نماز پوری کی

میں ان کے غیر معمولی

ہو گیا تھا

علامہ اقبال

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ ایسا ہی دل ہوتا ہے

کی وضع کرتے ہیں کہ دل میں ایمان کی یہ غیر معمولی

اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب دل میں توحید کی شمع روشن ہوتی ہے۔ جب ایک انسان کا دل جذبۂ توحید سے سرشار ہوتا ہے تو پھر اس کی دنیا ہی بدل جاتی ہے۔ پھر اس کا سر سوائے خدا کے کسی کے آگے نہیں جھکتا۔ اس کے دل میں سوائے خدا کے کسی کا خوف نہیں ہوتا۔ دنیا کی کوئی قوت اسے خوف زدہ نہیں کر سکتی۔ غم اس کے دل میں راہ نہیں پا سکتا اور ناساز گار سے ناساز گار حالات بھی اسے مایوس نہیں کر سکتے۔۔ وہ اللہ کا ہو جاتا ہے تو اسے ماسوا اللہ سے نجات مل جاتی ہے۔ خود علامہ اقبال فرماتے ہیں۔ ؎

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

ابو عبیدہؓ وجابان

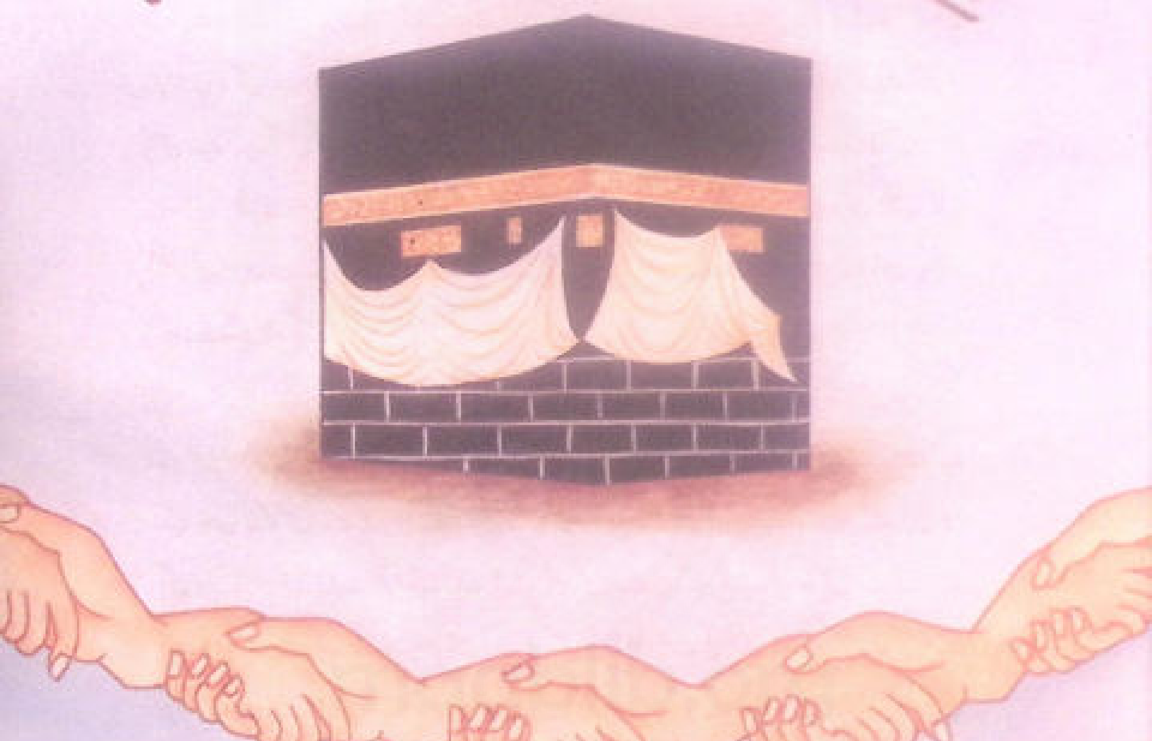
اخوتِ اسلامیہ

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ خلافت کی بات ہے۔ اسلامی لشکر حضرت ابو عبیدہؓ کی زیرِ قیادت ایرانی سپاہ کے خلاف برسرِ پیکار تھا۔ قوتِ ایمانی سے سرشار فرزندانِ اسلام نے اپنے وقت کی عظیم ایرانی سلطنت کے ایوانوں میں لرزہ ڈال رکھا تھا۔ ایرانی سلطنت اپنے تمام وسائل کے ساتھ مسلمانوں کے مقابلے پر آ گئی تھی۔ یزدگرد شہنشاہِ ایران نے اپنے بہترین سالاروں کو جنگ کی کمان سونپ رکھی تھی مگر اس کے باوجود ایرانی سپاہ شکست پر شکست کھا رہی تھی اور مجاہدینِ اسلام کے قدم آگے ہی بڑھ رہے تھے۔

ایسی ہی جنگ کے دوران میں شہنشاہ ایران یزدگرد کا ایک سپہ سالار ایک مسلمان سپاہی کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔ مسلمان مجاہد کو یہ معلوم نہیں تھا کہ گرفتار ہونے والا کس منصب اور مرتبے کا ایرانی ہے۔ ادھر ایرانی سپہ سالار نے بھی مکاری اور عیاری سے کام لیا اور اپنا نام بتائے بغیر مسلمان مجاہد سے رحم کی درخواست کی اور منت سماجت کر کے اس سے جان کی امان چاہی۔ مسلمان مجاہد نے لاعلمی میں جان بخشی کا عہد دے دیا اور اپنی تلوار نیام میں کر لی۔

جنگ میں ایرانیوں کو شکستِ فاش ہوئی اور ساسانی خاندان کی تمام شان و شوکت ختم ہو گئی۔ جنگ ختم ہونے کے بعد یہ راز کھلا کہ وہ ایرانی جس نے اپنا نام بتائے بغیر مسلمان مجاہد سے جان کی امان حاصل کر لی تھی، شہنشاہ ایران کا نامور سپہ سالار جابان ہے۔ چونکہ جابان کی

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ



وجہ سے مسلمان مجاہدوں کو بڑی تکلیفیں اٹھانی پڑی تھیں اور اس نے اسلام دشمنی میں حد سے گزر کر جو جو کام کیے تھے وہ ان سب کے علم میں تھے۔ اس لیے یہ معلوم ہوتے ہی تمام اسلامی لشکر میں بے چینی اور غصے کی لہر دوڑ گئی۔

اسلامی لشکر کے چند سرکردہ مجاہد لشکرِ اسلام کے سپہ سالار جناب ابوعبیدہ اللہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی۔

"اے امیر! جابان کو سزا ملنی چاہیے۔ اوّل تو یہ کہ یہ شخص ہمارا بہت بڑا مجرم ہے اور اس کے ہاتھ سے مسلمانوں کو جو دکھ پہنچے ہیں ان کا تقاضا یہی ہے کہ اس کے ساتھ کوئی رعایت روا نہ رکھی جائے۔ دوم یہ کہ اس نے دھوکے اور فریب سے کام لے کر ایک مسلمان مجاہد کی لاعلمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے امان حاصل کی ہے اور ایسی امان کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس لیے آپ ہمیں جابان کے قتل کی اجازت دیجیے۔"

حضرت ابوعبیدہؓ اس پائے کے سالار تھے کہ ان کا پختہ اور پائدار عزم میدانِ جنگ میں لشکر کی ضرورت سے بھی بے نیاز ہوتا تھا۔ انھوں نے اس معاملے کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد کہا۔

"اے میرے بھائیو! ہم سب مسلمان ہیں اور بھائی بھائی ہیں۔ ہم ایک ہی ساز کے تار ہیں اور ہم میں سے ایک ہی نغمہ پیدا ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں ہر امتیاز مٹ چکا ہے۔ ہمارے لیے بلالؓ کے حلق سے بلند ہونے والا نعرہ بھی نعرۂ حیدرؓ ہے اور قنبرؓ کے گلے سے نکلنے والی نوا بھی نوائے ابوذرؓ ہے۔ ہم سب ایک ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص کو یہ رتبہ حاصل ہے کہ اسے ملت کا امانت دار سمجھا جائے۔ ہم میں سے ہر شخص کی لڑائی ملت کی لڑائی اور ہر شخص کی صلح ملت کی صلح قرار پائے گی۔ جب ملت ہر فرد کی جان کی بنیاد بن جائے تو اس فرد کا عہد بھی ملت کا

عہد قرار پاتا ہے۔ میں مانتا ہوں کہ جابان ہمارا سخت دشمن رہ چکا ہے اور اس کے ہاتھوں مسلمانوں نے بہت دکھ اٹھائے ہیں لیکن یہ حقیقت بھی تو ہمارے سامنے رہنی چاہیے کہ ہمارا ایک مسلمان بھائی اسے جان کی امان دے چکا ہے۔ اے کائنات کے بہترین انسان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے لوگو! اگر ایک مسلمان نے کسی کو امان دے دی ہے تو ہم سب کا فرض ہے کہ اس کے پابند رہیں۔ اب جابان کا خون مسلمانوں کی تلوار کے لیے حرام ہو گیا ہے۔ ہمارے ایک بھائی نے اسے جو امان دی تھی، پورے لشکر کی طرف سے اس کی تصدیق کی جاتی ہے۔''

علامہ اقبالؒ نے حضرت ابو عبیدہ اور جابان کی اس حکایت کے ذریعے اسلامی اخوت کا نقشہ پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ ہادیِ دو جہاں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو فتح کرنے والی جس امت کی تشکیل کی تھی اس امت کے دل میں یہ بات بٹھا دی گئی تھی کہ تمام مومن بھائی بھائی ہیں۔ اس امت کے نزدیک رنگ، نسل یا کسی اور طرح کا ہر امتیاز ناقابلِ برداشت تھا اور مساوات اس کی فطرت میں رچی ہوئی تھی۔ اس امت میں نہ کوئی آقا تھا نہ غلام، نہ کوئی چھوٹا تھا نہ بڑا۔ اس امت کے افراد اسی طرح آزاد تھے جس طرح سرو باغوں میں آزاد ہوتے ہیں مگر اسلام نے ان کو خود شناسی اور آدم شناسی کا سبق دے کر ملت کی وحدت میں اس طرح پرو دیا تھا کہ اس کا ہر فرد ملت کا امانت دار بن گیا تھا اور اس کا ہر فعل بحیثیتِ مجموعی ملت کا فعل قرار پاتا تھا۔



سلطان مراد و معمار

مساواتِ اسلامیہ

ملکِ نجند (ترکستان) کے والی سلطان مراد کو خوب صورت عمارت اور عالی شان مساجد بنوانے کا بہت شوق تھا۔ اسی ملک میں ایک معمار تھا جس نے عمارات کی تعمیر میں بڑا نام پایا تھا۔ وہ ایک لاجواب کاری گر تھا اور اس کا کمالِ فن دیکھ کر فرہاد کی یاد تازہ ہوتی تھی۔

سلطان مراد نے اس معمار کی شہرت سنی تو اسے بلوایا اور ایک مسجد تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ معمار کو اپنے فن پر بڑا اعتماد تھا۔ اب تک اس نے جتنی بھی عمارتیں تعمیر کی تھیں۔ انھوں نے ہر چھوٹے بڑے سے خراجِ تحسین وصول کیا تھا مگر جب مسجد بن کر تیار ہوئی اور سلطان مراد نے اسے ملاحظہ کیا تو اسے وہ مسجد پسند نہ آئی۔ غصے میں آ کر اس نے معمار کا ہاتھ کٹوا دیا۔

معمار تو بھاری انعام و اکرام کی آس لگائے ہوئے تھا، اس انوکھے صلے کی توقع تو اسے خواب میں بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ اپنی محنت کا انعام اسے ہاتھ کٹنے کی صورت میں ملا تو وہ قاضی کے پاس فریاد لے کر پہنچا۔ اس نے سلطان مراد کے ظلم کی داستان قاضی کو سنائی اور کہا:

"آپ عدالت اور انصاف کی مسند پر تشریف رکھتے ہیں۔ آپ کی زبان پر جو کچھ جاری ہوتا ہے، وہ پیغامِ حق کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ آپ کا تو کام ہی شریعتِ محمدیؐ کی حفاظت ہے۔ میں بادشاہوں کی سطوت کا غلام نہیں۔ سلطان کے ظلم اور ناانصافی کی شکایت میں نے آپ سے گوش گزار کر دی ہے۔ اب میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ میرے دعوے کا



فیصلہ قرآن مجید کے حکم کے مطابق فرمادیں۔

قاضی نے معمار کی درد بھری داستان سُنی تو اسی وقت بادشاہ کی طلبی کا حکم جاری کردیا۔ اگلے روز جب بادشاہ قاضی کی عدالت میں حاضر ہوا تو عجیب سماں تھا۔ ایک طرف غریب معمار تھا اور دوسری طرف ملک کا بادشاہ مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔ بادشاہ کو معلوم ہو چکا تھا کہ معمار نے قرآنی حکم کے مطابق فیصلہ چاہا ہے۔ قرآن کی ہیبت سے اس کا رنگ اڑ گیا تھا اور وہ ایک خطا کار کی حیثیت سے قاضی کے سامنے کھڑا تھا۔ مارے شرمندگی کے اس کی نظریں پاؤں پر گڑی ہوئی تھیں اور چہرہ لال ہو رہا تھا۔

جب مقدمہ پیش ہوا تو سلطان مراد نے اعترافِ جرم کرلیا اور کہا۔ ''میں اپنے کیے پر پشیمان ہوں اور اقبالِ جرم کرتا ہوں۔''

قاضی جو اپنی رائے میں آزاد اور اپنے فیصلوں میں دیانت دار مشہور تھا، اس نے کہا۔

''یہ معاملہ تو قصاص کا ہے اور ارشادِ قرآنی کے مطابق قصاص ہی میں زندگی ہے۔ جو شخص کسی دوسرے کے ساتھ جس قدر زیادتی کرے، اُس سے اس کا ویسا ہی بدلہ لیا جائے۔ آنکھ کے بدلے آنکھ، کان کے بدلے کان اور ہاتھ کے بدلے ہاتھ۔ ظاہر ہے کہ مسلمان کسی درجے میں احرار سے کم تر نہیں سمجھا جاتا اور بادشاہ کا خون معمار کے خون سے زیادہ قیمتی نہیں ہوتا۔''

جب سلطان مراد نے یہ حکمِ ربانی سنا تو اس پر لرزہ طاری ہوگیا اور اس نے بلا حیل و حجت اپنا ہاتھ آستین سے باہر نکال کر سزا کے لیے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اس حکم سے سرتابی کی مجال نہیں۔ قصاص لے لیا جائے تاکہ حکمِ قرآنی پورا ہو۔''

سلطان مراد نے سزا کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا تو معمار کا دل پسیج گیا۔ اسے خاموشی

کی تاب نہ رہی۔ حکمِ قرآنی کے سامنے سلطان کے سر جھکا دینے پر وہ اپنی تکلیف بھول گیا اور اس کی زبان پر قرآن کی وہ آیت جاری ہوگئی جس میں عدل کے ساتھ احسان کی بھی تلقین فرمائی گئی ہے اور قصاص کے ساتھ احسان کرنے اور بخش دینے کو بھی ایک فضیلت کی بات قرار دیا گیا ہے۔ اس نے کہا:

''میں سلطان کو خدا کے لیے معاف کرتا ہوں۔ رسولؐ اللہ کے لیے معاف کرتا ہوں۔ میں بدلہ لینا نہیں چاہتا۔ میرے لیے بس یہی کافی ہے کہ سلطان نے اپنی غلطی تسلیم کر لی اور اپنے آپ کو آئینِ پیغمبرؐ کے سامنے جھکا دیا۔''

علامہ اقبالؒ نے سلطان مراد اور معمار کی اس حکایت کے ذریعے اسلامی مساوات کا ایمان افروز نقشہ پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ اسلام میں چھوٹے بڑے، امیر غریب سب برابر ہیں۔ اسلامی قانون میں امیر اور غریب، آقا اور غلام، بادشاہ اور گدا، حاکم اور محکوم، راعی اور رعایا کے درمیان کوئی فرق، کوئی امتیاز نہیں۔ حکایت میں جب قاضی قصاص والی آیت پڑھتا ہے تو ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ قانونِ اسلام کی نظر میں مسلمان غلام اور آقا میں کوئی فرق نہیں اور بادشاہ کا خون ایک معمار کے خون سے زیادہ سرخ نہیں ہوتا۔



حکایت کے آخر میں جب معمار سلطان مراد کے احساسِ ندامت اور قانون کے سامنے سر جھکا دینے سے متاثر ہو کر اسے معاف کر دیتا ہے تو اسلامی مساوات کے ساتھ ساتھ آئینِ پیغمبرؐ کا دبدبہ بھی واضح ہو جاتا ہے جس کی بدولت ایک کمزور چیونٹی حضرت سلیمانؑ پر فتح پاتی ہے اور ایک معمولی معمار سلطان کے مقابلے میں کامیاب ہوتا ہے۔ یہ صرف اس لیے ہے کہ قرآن کے سامنے آقا اور غلام ایک ہیں۔ وہ بوریا نشیں اور مسند نشیں کے درمیان کوئی فرق روا نہیں رکھتا۔



سائلِ مظلوم

ایک روز ایک فقیر ہمارے دروازے پر آیا اور آ کر بار بار صدائیں لگانے لگا۔ میرے دورِ جوانی کا آغاز تھا۔ عمر کی ناپختگی کے اس دور میں عقل نیک اور بد، درست اور نادرست کم ہی سوچتی ہے۔ طبیعت کے خلاف ذرا سی بات اشتعال پیدا کرنے کا باعث بن جاتی ہے۔ فقیر کے بار بار صدائیں لگانے سے مجھے غصہ جو آیا تو میں نے ایک ڈنڈا اٹھایا اور اس کے سر پر دے مارا۔ اس نے بھیک مانگ کر جو کچھ اپنی جھولی میں جمع کیا تھا وہ سب زمین پر گر پڑا۔

میری طبیعت کا یہ رنگ دیکھ کر والدِ گرامی بہت آزردہ ہوئے اور ان کے دل کو بہت بڑا صدمہ پہنچا۔ ان کا چہرہ پیلا پڑ گیا، آنکھوں میں آنسو آ گئے اور ایک آہ بے اختیار ان کے ہونٹوں سے نکل گئی۔ والدِ گرامی کی یہ کیفیت دیکھ کر میں سہم گیا۔ میری جان میرے بدن میں کانپنے لگی کہ معلوم نہیں والدِ گرامی اب مجھ سے کیا سلوک فرمائیں گے۔ انھوں نے مجھے اپنے پاس بلا کر آنسوؤں بھری آنکھوں کے ساتھ کہا۔

"اے فرزندِ عزیز! قیامت کے دن جب امتِ مسلمہ اپنے آقا و مولا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جمع ہوگی۔ ان میں غازی بھی ہوں گے اور شہید بھی، ان میں عالم بھی ہوں گے اور زاہد بھی، صوفی بھی ہونگے اور فقیہ بھی، عاشقِ صادق اور نیکوکار بھی ہوں گے اور گناہ گار بھی۔ اس بھری محفل میں جب یہ مظلوم فقیر تیرے ظلم اور بدسلوکی کی شکایت کرے گا تو اندازہ کرو کہ اس وقت میری شرمساری کا عالم کیا ہوگا۔ اس وقت جب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرمائیں گے کہ حق تعالیٰ نے ایک مسلم نوجوان کو تربیت کے لیے تیرے سپرد کیا



تھا لیکن تجھ سے اتنا نہ ہو سکا کہ تو اسے اخلاقِ حسنہ سے آراستہ کر دیتا۔ تو بتاؤ میں کیا جواب دوں گا؟ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرمائیں گے کہ اس نوجوان نے تو میری ادب گاہ سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا اور تُو اس آسان کام کو بھی پورا نہ کر سکا کہ مٹی کے ایک انبار کو آدمی بنا دیتا، تو بتاؤ اس وقت میں کیا جواب دے سکوں گا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بات کے جواب میں اپنی کیا صفائی پیش کروں گا؟"

والدِ گرامی لطف و کرم کا پیکر تھے وہ اگرچہ مجھے ملامت کر رہے تھے مگر ان کی گفتگو میں بڑی نرمی اور ملائمت تھی۔ میں شرم کے مارے پانی پانی ہوا جا رہا تھا۔ اور امید و بیم میں مبتلا تھا۔ انھوں نے اسی طرح نرمی اور ملائمت سے فرمایا۔

"اے میرے فرزند! اپنے بوڑھے باپ پر یہ ظلم تو نہ کر کہ کل مجھے اپنے آقا و مولا کے سامنے نادم ہونا پڑے۔ تو مسلمان ہے تو سیرتِ محمدیؐ کا اتباع کر۔ مسلمان ہو کر اسوۂ حسنہ کی پیروی سے محروم رہنا زندگی کی سب سے بڑی محرومی ہے۔ تجھے حضورؐ ہی کی نسیمِ بہار سے رنگ و بو حاصل کرنا چاہیے، تیرے لیے حضورؐ ہی کی سیرت سے حصہ لینا لازم ہے۔ دیکھ! مولانا رومؒ کیا اچھی بات کہہ گئے ہیں کہ اپنی زندگی کا رشتہ ختم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ توڑ، اپنے علم و فن اور اپنی روش پر بھروسا مت کر۔

اے فرزندِ عزیز! مسلمان کی فطرت تو سر سے پاؤں تک شفقت ہی شفقت ہے وہ پاک ذات جس کی انگلی کے اشارے سے چاند دو ٹکڑے ہو گیا تھا۔ وہ سب کے لیے رحمت تھی اور اس کا لقب بھی رحمت اللعالمین تھا۔ تو اگر حضورؐ کے مقام سے دور رہا تو جان لے کہ ہمارے گروہ ہی سے خارج ہے۔

اے میرے بیٹے! تو ہمارے باغ کا پرندہ ہے سو ہم سے الگ ہو کر نغمہ سرا نہ ہو۔ اس

دنیا میں جس شے کو بھی زندگی ملی ہے وہ جب کسی ناسازگار اور ناموافق فضا میں پہنچتی ہے تو مر جاتی ہے۔ تو بلبل ہے تو تیرے لیے باغ ہی کی فضا سازگار ہے۔ اگر تو عقاب ہے تو دریا کی تہ میں زندگی بسر نہ کر تیرا صحیح مقام صحرا کی تنہائی ہے اگر تو ستارہ ہے تو پھر اپنے آسمان کے سوا اور کہیں نہ چمک۔ اپنے گردو پیش اور سازگار ماحول سے باہر قدم نہ رکھ۔

''اے فرزندِ عزیز! ہر جاندار شے کا خاصہ یہی ہے کہ وہ سازگار ماحول میں نشو ونما پاتی ہے۔ ناسازگار فضا میں نہ صرف اس کی ترقی رک جاتی ہے بلکہ اسے زوال آنا شروع ہو جاتا ہے۔ قطرۂ نیساں کو اگر صدف کی آغوش کی بجائے غنچے کا دامن نصیب ہو تو وہ کبھی گوہر نہیں بن سکتا۔ ابرِ بہار کا جو بھی قطرہ سمندر سے دور رہ جائے گا، وہ شبنم کے قطروں کی طرح خس و خاشاک کی نذر ہو جائے گا۔ جو چیز اپنے ماحول سے الگ ہو جاتی ہے۔ اس کا انجام یہی ہوتا ہے۔

اے میرے بیٹے! مسلمان کی سرشت بھی موتی کی طرح پاک ہے۔ اسے اگر آب و تاب ملتی ہے تو فقط رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سمندر سے ملتی ہے۔ پس اگر تو ابرِ بہار کا قطرہ ہے تو اس سمندر کی آغوش میں پہنچ اور اس کی تہ سے موتی بن کر باہر نکل۔ پھر تو دنیا میں سورج سے بھی زیادہ روشن ہوگا اور ایک ایسی تابانی و درخشانی کا مالک بن جائے گا جو دائمی اور جاودانی ہوگی۔

علامہ اقبالؒ نے اپنے آغازِ شباب کے دور کی اس حکایت کے ذریعے یہ امر واضح کیا ہے کہ حُسنِ سیرت پیدا کرنے کے لیے آدابِ محمدیؐ کی پابندی لازم ہے۔ اور اسوۂ حسنہ کی پیروی کیے بغیر کوئی مسلمان صحیح معنوں میں مسلمان نہیں بن سکتا۔

علامہ اقبالؒ نے یہ وضاحت فرمائی ہے کہ ایک اعلیٰ اور فیض بخش زندگی بسر کرنے کے

لیے صرف پختگی اور پختگی کافی نہیں، اس کے لیے دلکشی اور دلنوازی کی بھی ضرورت ہے۔

مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دل نوازی کا
مروّت حسنِ عالمگیر ہے مردانِ غازی کا

محکم کردار کا انسان ہر مشکل پر قابو پالیتا ہے اور ہر مہم کو سر کر لیتا ہے۔ لیکن زندگی محض مہموں کو سر کرنے اور مشکلات پر قابو پانے کا نام نہیں۔ اس میں نازک جذبات اور لطیف احساسات بھی ایک مقام رکھتے ہیں۔ تاریخ عالم میں ایسی مثالیں ایک دو نہیں، سیکڑوں مل جائیں گی کہ جن لوگوں نے اپنے زورِ بازو سے ملک فتح کیے اور زر و جواہر کے ڈھیر خراج میں وصول کیے۔ ان کے مقابلے میں ان لوگوں کی قدر و منزلت زیادہ ہے جنھوں نے اپنے حسنِ اخلاق سے لوگوں کے دلوں کو مسخر کیا۔ اسی لیے علامہ اقبالؒ ایسی قوت و پختگی کے حق میں ہیں جو حسنِ اخلاق اور تعمیری اقدارِ حیات کے تابع ہو۔ کیونکہ اگر ہماری سیرت قابلِ احترام نہ ہو تو جن مقاصد کی تبلیغ ہم کرتے ہیں اور جن اصولوں کی نشر و اشاعت کی خاطر ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ ان کے لیے دوسروں کے دلوں میں کوئی جگہ پیدا نہیں ہوگی۔

اس کے لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی حسنِ سیرت کے کامل ترین نمونے کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ حضورؐ کی ذات رحمت و الفت کا بے مثال پیکر تھی۔ آپ نے صرف دوستوں ہی پر لطف و عنایت نہیں فرمائی بلکہ دشمنوں سے بھی مروت اور عفو کا سلوک رکھا۔ حضورؐ کی ہمدردی و دل سوزی غیر محدود اور حضورؐ کا جذبۂ خیر لامتناہی تھا۔

علامہ اقبالؒ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ کریمانہ کی پیروی کرنے کے حق میں یہ دلیل بھی دیتے ہیں کہ ہر جان دار چیز صرف اپنے سازگار ماحول میں نشو و نما پاتی ہے۔ اگر اسے سازگار ماحول نہ ملے تو نہ صرف اس کی ترقی رک جاتی ہے بلکہ اسے زوال آتا

شروع ہو جاتا ہے۔ بارش کے قطرے کو اگر صدف کی بجائے غنچے میں رکھا جائے تو وہ کبھی موتی نہیں بن سکتا۔ موتی بننے کے لیے ضروری ہے کہ قطرہ سمندر میں پہنچے اور صدف کی گود میں پرورش پائے۔ پھر اس کی چمک دمک تارے کی چمک دمک اختیار کر لے گی کیوں کہ وہ اپنے اصل ماحول میں پہنچ جائے گا۔ اسی طرح مسلمان کی فطرت کا گوہر اخلاقِ محمدیؐ کے صدف ہی سے آب وتاب حاصل کر سکتا ہے۔





اقبال اکادمی پاکستان